اردو ادبیات کا نقیب اور تخلیق و تنقید کا اشاریہ
ماہنامہ
سخن دان

اگست 2021ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشمولات

مضامین

افسانے

غزلیات

نظمیں

تراجم

خطوط

اداریہ

اداریہ

ناقوس

فطرت کا ہر تناظر توازن کے اصول پر قائم ہے۔ یہ Perspective چاہے اعتقاد سے وجود پائے یا عمل کا حصہ بنے، اس میں نظامِ تناسب کی فعال حالت سے کسی صورت انحراف نہیں برتا جا سکتا۔ کیوں کہ فطرت کا مادۂ وجود ہی اعتدال کے ستون پر کھڑا ہو کر شعور کے اوضاعِ متناسبہ کے ساتھ ایک حاکمانہ مرابطہ روا رکھتا ہے اور اس بنیاد پر بعض ضروری نسبتوں کا حال بھی فراہم کرتا ہے۔ خیر! یہ فلسفیانہ سطح کا زائیدۂ خیال ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ وجود اور شعور کی تمام Faculties کا ایک مشترکہ عمل تہذیب کی حیات کاری (Vitalization) یا قانونِ حیات کی آزادانہ تاسیس ہی نہیں، بلکہ انسانی تہذیب کے معتقدات کی پرورد گی اور حفاظت بھی ہے۔ اور اس حفاظت کا تعلق ادراک اور اظہار کے دو بڑے پیمانوں کے ساتھ محض رسمی نہیں، حقیقی ہے۔

تخلیق کسی بھی تہذیب کا زندہ عمل کہلاتا ہے۔ کیوں کہ فطرت کا سب سے بڑا مسئلہ تخلیق اور جوازِ وجود ہے۔ وجود یہاں کوئی منطقی اصطلاح نہیں بلکہ تنفس کا شعوری عمل ہے۔ تخلیق شعور کی محتاج نہیں لیکن اس سے مکمل آزاد بھی نہیں۔ اس لیے کہ تخلیق یا اظہار کا عمل شعور کی خود مختار اصالت اور جذبۂ جمال کی ترفعانہ حرکت سے ترکیب پانے والی حالتِ حضور سے نمو دہی نہیں وصولتا بلکہ بعض تہذیبی مسلمات کا ضامن بن کر ادراک کی تہوں میں نئے نئے معانی کا کنبہ بھی ایجاد کرتا ہے یا دریافت کرتا ہے۔ جوازِ اظہار کی یہ کوئی شاعرانہ توجیہ نہیں بلکہ منطقی (Argumentative) استدلال کی اساس پر قائم ایک واضح عمارت کا ڈھانچہ کھڑا کیا ہے۔

اس کثیف تمہید سے مقصود تخلیق کی ضرورت اور اہمیت اور اس کی وجودی حیثیت کی کماحقہ پذیرائی کرنا تھا۔ اگر سوال اس کے انطباق کا ہو تو سخن دان کی ترجیح یہی ہے کہ فطرت، ادب، تہذیب اور انسان کا تعلق ہر ادبی و نیم ادبی تناظر میں سمجھنے کی اجتماعی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ ہائے دراز کی جنبانی میں ادب کے موضوعی تناظرات کا بھرپور احصا کیا جائے۔ شخصی مطالعوں کی بہ نسبت فنی و فکری حوالوں سے ادب کے موضوعات کو بنیاد بنانے کی روش کو عام کیا جائے۔ اور ضرورت ہے کہ ادب کے ضمنی پیش منظر کی بدلتی ہوئی بلکہ تنزل میں اتری ہوئی صورتِ حال پر ذمہ دارانہ گرفت حاصل کر کے اصولِ حیات سے وفاداری کا ثبوت دیا جائے۔ بلکہ اگر سپاٹ بیانیہ اختیار کروں تو میری مراد یہ ہے کہ ادب کا مخصوص حوالوں کے ذیل میں مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے کہنہ طرز کی ہر بساط لپیٹ لی جائے اور کسی بھی تہذیبی مگر آزاد تناظُر کو اختیار کرتے ہوئے شعور کی تربیت اور علم کی پرداخت کا عمل پہلے کی بہ نسبت زیادہ تیز کر دیا جائے۔ یہ ہمارا تہذیبی ورثہ بھی ہے اور جمالیاتی فرض بلکہ قرض بھی۔

صلائے عام ہے، آؤ! کہ ادب کو نئے نئے تناظرات میں جامہ پوش دیکھنے کی حسرت کو مٹانے کا وقت قریب ہے۔ محض فن اور فکر کے جھوٹے افسانوں کو زندہ دفن کرتے ہوئے ادب اور فطرت، ادب اور تہذیب، ادب اور انسانی منطقی شعور کا تعلق اور تہذیبی مسلمات کی ردّ تشکیل کی ضرورت اور کوششوں کا جائزہ لینے کی ابتدائی کاوش کی جائے۔ سخن دان آپ کی آواز سنے گا اور اسے اپنی دیواروں کا نوشتہ بنا کر حقیقت کی آنکھ بننے کے عمل میں پر خلوص سعی کا ضامن رہے گا۔

سخن دان کا حاضر شمارہ آپ کی بصارتوں پہ تُلا ہوا ہے، اسے پذیرائی بخشیے اور آئندہ مندرجۂ ذیل موضوعات پر لکھنے کی یقین دہانی دلائیے :

1) ادب ایک فطری ضرورت کا حل کیسے ہے؟
2) ادبی تہذیب کیسے اپنا معتقدہ پیدا کرتی ہے؟
3) کیا ادب کو نئے نئے تناظر میں پڑھنا/ تخلیق کرنا ہماری جمالیاتی ضرورت ہے؟
4) جذبۂ جمال کی تربیت کن ادبی اصولوں کے ذریعے ممکن ہے؟
5) متن اساس تنقید میں متکلم کی حیثیت ایک تہذیبی کارندے سے بھی گر جاتی ہے؟ ہاں تو کیسے؟
6) ادب ہمارا ذہنی مسئلہ ہے یا روحانی؟
7) ادراک، احساس اور اظہار کے مراحل میں ادبی فکر کی ردّ تشکیل کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ اور اسے کیا ہونا چاہیے؟

مضامین

وقاص اکمل جام

شعیب افضال کی شاعرانہ رفتار؛ ایک تجزیہ

واقعہ یہ ہے کہ جب شعر و شاعری کا ذکر ہوتا ہے تو ہمیں معلوم پڑتا ہے کہ اشعار فرسودگی کی داستانیں نہیں ہیں بلکہ حقائقِ زمانہ ہیں اور ان حقائق کی تلاش میں ایک ایسا شاعر مطلوب ہے کہ جس کی شاعری سرمدی کیف اور فکری پرواز رکھتی ہو۔ اسی تلاش میں میری ملاقات ایک ایسے شاعر سے ہوئی ہے جن کی روح صوفی ہے اور مزاج تحقیقی۔ شعیب افضال کا دماغ محقق ہے، روح صوفی اور تخیل عارفانہ ہے۔

شعیب افضال اس کائنات میں اپنی موجودگی اور اپنے انفرادی نقوش اس درجہ واضح رکھتے ہیں کہ ان کی شاعری کی گونج اس کائنات کے اسباب تک جاتی ہے۔ ان کا فکرانگیز پیرایہ اس بات کا ادراک کرتا ہے کہ ان کی داخلی کیفیت مطالعہ، حسی تجربہ اور روحانیت کے زیرِ اثر ہے۔ اس کامل و کامران شاعر کے خاکی ڈھانچہ میں لامحدود غیر مرئی قوت ہے جو ان کے تخیل کے کینوس کو صوفیانہ اور اسلوب کو عارفانہ کرتی ہے۔

آیئے! بات کرتے ہیں ان کے محاسنِ کلام کی

فطری تمثیل کاری:

شعیب افضال صاحب میں یہ وصف بہ درجہ اتم موجود ہے کہ وہ مظاہرِ فطرت کو اپنے علمی و روحانی اظہاریے اور متصوفانہ خصائل کی نمائندگی کے لیے سامنے لاتے ہیں۔ یہ صوفی رہبانیت اختیار نہیں کرتا، یہ ترکِ دنیا نہیں کرتا کہ اس سیارے پہ موجود ہے اور اپنے اشعار سے فکر و نظر کے نئے رجحانات اجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔ فطرت جو کائنات کی دھڑکن ہے ان کے اشعار سے تنفس پاتی ہے اور جاوداں ہوتی چلی جاتی ہے:

جب کٹ گرے شجر تو پھری دھوپ دربدر سوکھی پڑی زمین تو چشمے نگل گئی

یہ چاند موج میں رکھتا ہے مجھ چکوری کو کبھی گھٹائے ہوئے لو کبھی بڑھائے ہوئے

بلبل کا نغمہ جسے شعرا اپنی کیفیت کے اظہار کے لیے علامت سمجھتے چلے آئے ہیں، اس نغمے کو شعیب صاحب اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔

سن کر یہ تان میری سرگوشیاں چمن میں لوٹا ہے پھر وہ بلبل نغمہ سنا سنا ہے

تجرباتی وصف:

شعیب افضال کی ماہیتِ تصوف ان کے تجرباتی وصف میں ڈھل کر ایک فکرانگیز پیرایہ زیبِ تن کرتی ہے جس میں آہنگ کا قیام بھی رہتا ہے اور بیدار شاعر کی خود شناسی کی دلیل بھی توانا ہوتی ہے۔ ان کا تجرباتی وصف مدت کی ریاضت اور مزاولت کا حاصل ہے۔ ان کا یہ وصف ان کے اشعار کے قالب میں ڈھل کر سامنے آتا ہے:

جھیل کی تلچھٹ میں بیٹھی کسمساتی ریت ہوں　　روشنی ہو جاؤں گا پھر کائناتی ریت ہوں
ہاں ہاں انہی جگہوں پہ انہی راستوں کے بیچ　　اک صبح کی تلاش میں تیرہ شبوں کے بیچ

منظر نگاری:

مسافری اور سیاحت جو توانا وصف ہیں۔ یہاں تحیر آمیز اور نشاط انگیز عنصر کے طور پر موجود ہیں۔ اپنے وطن پاکستان سے دور یہ مسافر پرندوں سے پیار کرنے کی فطرت رکھتا ہے اور مناظر کو من و عن اپنے شاعرانہ اسلوب میں ڈھالنے پر قادر ہے۔ مناظر ان کے قلم سے بقا پاکر قرطاس پر نقش ہوتے ہیں اور قاری کے سامنے ایک بڑا منظر آتا ہے جو اس درجہ واضح ہوتا ہے کہ قاری اس منظر کا شاہد ہوا چاہتا ہے:

لاجوردی بادلوں کی اوٹ میں جلتا ہوا　　آفتاب اک اور دیکھا ہے ادھر کوتاہ سا
ترا خیال مرا رنگ یوں بدلتا ہے　　پرند جیسے ہوا سے فریب کھاتے ہیں

فکری ترفع:

شعیب افضال کے ہاں لطافتِ دل کو فکرِ دوامی کا سامان جا بجا ادب کے موتیوں میں پرویا ہوا ملتا ہے۔ ظلمت کے ان شب و روز میں ان کا فکری رجحان مژدۂ سحر ہے۔ یہ فکر نہ فلسفہ ہے نہ بحث و جدال بلکہ یہ اک صوفی کا جام ہے جو دل کو سرشار کر دیتا ہے۔ ان کی صوفیانہ فکر کی پرواز تخیل کے وسیع ذخائر کی کنجی ہے جسے یہ قاری کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کی فکر اک تار گھر کے جیسی ہے کہ جیسا پیغام خلوتِ بیدار میں ملا، من و عن پہنچا دیا۔ حیات و بعد از حیات جیسے اسرار ان کے سامنے عیاں ہیں:

یہاں ہر ایک رونا رو رہا ہے بے ثباتی کا　　حیاتی جاوداں ہوتی ہے جب بے باک بنتی ہے
ان ظلمتوں سے اسکا گزر ہو محال ہے　　اثبات کے قفس میں پرندہ ہے ذات کا

محسوسات کا سلسلہ:

شاعر عموماً مختلف کیفیات سے گزرتے ہوئے مختلف خیالات و محسوسات کو بیان کرتا ہے مگر یہاں آپکو تخیل میں اک تسلسل دکھائی دے گا۔ ان کی روح اس کائنات و مافیہ اور حیات قبل از تخلیقِ اجسام سے اس خوبصورت تسلسل کے ساتھ جڑی ہے کہ ان کی شاعری اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ثابت ہوتی ہے۔ ان کا تخیل اس قدر مسلسل ہے کہ قاری ان کی پوری شاعری ایک نشست میں پڑھے بغیر نہ رہ پائے۔ یہ اسرارِ تخلیق انسان سے واقف ہیں اور شعور کی یہ بیداری ادراک کے تمام زینوں کو سر کرنے کے بعد آتی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

برا کیا کہ بھلا خوب ایک کام کیا　　زمیں پہ اترا سماوات کو سلام کیا

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

میں جنت زاد ہوں کچھ دن زمیں پر آ بسا ہوں　　یہ حورانِ بہشتی سب مجھے پہچانتی ہیں

اصوات کے آہنگ:

یہ صوفی محورِ رقص ہے اور اس کے مراقبانہ رقص سے موسیقی جنم لیتی ہے۔ یہ قلندر محوِ دھمال ہے اور اس کے پاؤں کی دھمک سے ترنم پیدا ہوتا ہے۔ یہ رند گوشۂ خلوت میں ہے اور اس گہری خاموشی سے سُر جنم لیتے ہیں۔ تمام موجود

ان کی شاعری کے سنگ پر کیف و پر لطف موسیقی اور ترنم کی تال پہ ساعتوں میں لطف انڈیلتا ہے۔ ان کی شاعری کو دوام حاصل ہوگا کہ یہ الفاظ کے قالب کو صوت کی حدت پہ پکاتے ہیں۔ پھر کرب و یاس کو سمیٹ کر اس کا رس مصرعوں میں گھولتے ہیں بالآخر ترنم کے وہ تار چھیڑتے ہیں کہ قاری کے لطف کے مدارج طے ہوتے جاتے ہیں:

یہ دلخراش واداس صبحیں و بال شامیں عذاب راتیں جمالِ خوباں پرانا قصہ جنوں محبت فضول باتیں

ترنم وگائگی کی اک اور لے دیکھیں:

یہ بجھی بجھی سی راہیں یہ شکست بے کرانہ نہ مقام دلنوازی نہ سلوک دلبرانہ

صاحبِ اسرار:

مجھے حیرت کی جگہ خوشی ہوئی کہ ان کا اندازِ بیان اسقام سے پاک ہے اور اسلوب کا تنوّع اس بات کی عکاسی ہے کہ راقم الہام اور تجزیہ و تجربۂ عرفان کے وہ مراحل طے کر جاتا ہے جس کے بعد تمام پردے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں تہہ داری ہے اور یہ تہیں قطعاً الجھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ یہاں تہہ داری میں سلجھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک درویش کے سامنے یہ دنیا ومافیہا ایک شیشے کی مانند ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ کائناتی اسرار ورموز بے لباس ہو کر اس کے سامنے آتے ہیں اور اسرار فہمی کے مدارج کا ادراک ہوتا جاتا ہے:

سراغ ڈھونڈھتا اپنا کدھر نکل آیا یہ کس نے باندھی گرہ میری لامکانی میں

بھیتر یہ چار سانس کی مہلت دھری ہوئی منہ دیکھتی ہے میرا قیامت کھڑی ہوئی

المختصر شعیب افضال ایک ایسے شاعر ہیں جو ایک سیارے پہ موجود ہو کر اس کائنات کی امکاناتی وسعت اور تمام تر امکانات کو مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وسیع کینوس پہ محیط اس شاعری کا مستقبل تابناک ہے جس کی حدت سے آنے والی نسلیں تحریک، توانائی اور روشنی پائیں گی۔

۞۞۞۞۞

تنزیلہ شبیر

ڈاکٹر ہدایت اللہ کی شاعری کا تحقیقی جائزہ

کہتے ہیں کہ شاعر وادیب اپنے عہد کا نباض ہوتا ہے اور اس کی شاعری میں اس کے عہد کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کے طرزِ احساس کو اپنے وجدان سے چھوتا ہے۔ انسانی جذبات واحساسات کو کائنات کی سیر کراتا ہے۔ زماں ومکاں کے معاملے کو اپنی تخلیقی آنکھ سے دیکھتا ہے اور پھر ایسے یوں بیان کرتا ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ڈاکٹر ہدایت اللہ کی شاعری کا ہے۔ ڈاکٹر ہدایت اللہ اردو ادب کی فلک پر ابھرتا ہوا وہ ستارہ ہے جنھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے "ہُو کا عالم" ہی سے قارئینِ ادب کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ یہ میدان ان کا نہیں تھا مگر وہ کہتے ہیں نا کہ ادب کسی کی میراث نہیں! اور جب خداداد صلاحیتیں انسان میں موجود ہو تو ادب کی کسی نہ کسی صورت میں آپ منوالیتی ہے۔

ہدایت اللہ اچھے انسان ہیں۔ مزاج میں ٹھہراؤ ہے اور نرم لہجے میں بات کرتے ہیں۔ دوسروں کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہیں۔ طبیعت میں درویشی وانکسار، تحمل وبردباری ہے۔

ڈاکٹر ہدایت اللہ کا تعلق صوبہ خیبر پختون خواہ کے ضلع صوابی سے ہے۔ آپ کی مادری زبان پشتو ہے مگر بچپن سے اُردو شعر وادب سے شغف رکھتے تھے۔ آرمی میڈکل کالج راولپنڈی سے ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد پاک فوج میں شمولیت اختیار کی اور تقریباً ستائیس برس ملازمت کے بعد عہدے سے ریٹائر ہوگئے۔ "ہُو کا عالم" ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں لکھی گئی شاعری کا مجموعہ ہے۔

بلا کا شور تھا باہر ہمارے مگر اک ہُو کا عالم دل کے اندر

کسی بھی شاعر وادیب کی تخلیقی اور فنی سفر کو اس وقت تک پوری طرح سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس کے گردوپیش کو دھیان میں نہ رکھیں۔ خاص طور پر وہ تہذیبی وسماجی حالات جن میں کسی لکھنے والے کی زندگی کے ایام گزرے ہوں، بچپن کا ماحول، وہ لوگ جن کے ساتھ بچپن گزرا، حیاتِ فرد پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ہدایت اللہ کی فنی وتخلیقی شخصیت کو بھی ان کے ماضی اور حال کے حالات نے متاثر کیا اور ان تمام حالات وواقعات کو انھوں نے قلم کی زینت بنایا۔

ہدایت اللہ نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ہدایت اللہ کا پہلا شعری مجموعہ "ہُو کا عالم" جنوری 2021ء میں بک کارنر جہلم سے شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ دعا، حمد ونعت، نظم اور غزل پر مشتمل ہے۔ مختلف ادوار میں لکھی گئی نظمیں اور غزلیں بھی اس کتاب کی زینت بنیں جن سے ان کی قلبی واردات اور تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقات نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ فنی سطح پر بھی قابلِ ذکر ہیں۔

وقت کے ساحلوں سے چن چن کر
سیپ کچھ بے قرار لمحوں کے
بند جن میں مری وفا کے نگین
آج اس راہ پر بکھیر دیئے
ہاں یہی راہ جس پہ ہم دونوں
ہم سفر تھے نہ ہم قدم لیکن
ایک ہی راہ کے مسافر تھے
جس سے بکھرے تری نظر کے سراب
اور فروزاں مری وفا کے نگین
آج یہ رہگذر تمام ہوئی

ہدایت اللہ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے روایت اور اپنی انفرادی صلاحیتوں کے خوبصورت امتزاج سے اُردو شاعری کو نئے محرکات اور نئے امکانات سے روشناس کیا ہے۔ اسی طرح ان کی غزل میں بھی ان کی آواز باقی آوازوں سے منفرد و توانا لب و لہجہ کی حامل ہے۔

محبت کی، عقیدت کی کرم فرمائیاں دیکھو
ہمارے ساتھ رہتی ہیں کئی پرچھائیاں دیکھو
نہیں مرتی ہماری موت سے یہ زندگی ہر گز
سمندر میں چھپے دریاؤں کی انگڑائیاں دیکھو
ہدایت ؔ ہر کوئی مصروف اپنی زندگی میں ہے
بھرے شہروں میں انسانوں کی یہ تنہائیاں دیکھو

ہدایت اللہ کی شاعری میں محبت کا ایک نیا زاویۂ نظر کے تحت ان کی غزل رنگ و نور کا طیفِ منور محسوس ہونے لگتی ہے۔ لفظوں کی استادانہ بنت اور اسلوب نرم، لطیف اور شاعرانہ ہے۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری کا لہجہ بھی دھیما پن لیے ہوئے ہے۔

امجد اسلام امجد ہدایت اللہ کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا کچھ اس طرح اظہار کرتے ہیں:

"ڈاکٹر ہدایت اللہ کا شمار نو وارد مگر امکانات سے بھرپور شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے موضوعات کا چناؤ، طرزِ بیان اور موزوں ترین الفاظ کا انتخاب پہلی نظر ہی میں اپنی طرف متوجہ کرتا اور خوشگوار تاثر چھوڑتا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ آنے والے دنوں میں بھی شاعر کے مزید فنی کمالات دیکھنے کو ملیں گے اور شاعر کا نام ہی شعر کی خوبی کا تعارف بن جائے گا۔"

احساسِ تنہائی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ہدایت اللہ نے یہاں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں احساسِ تنہائی بڑے تعمیری انداز میں ملتی ہے جو انسانوں کو قنوطیت کا درس نہیں دیتا بلکہ انھیں

استقلالِ طبع عطا کرتا ہے۔

یونہی سنسان پڑی تھی مرے دل کی بستی
کتنی بے رنگ تھی ڈھل کر مری تنہائی میں
ترے آنے سے بدل ہی گئی دنیا دل کی
رنگ ہی رنگ بکھرنے لگے تنہائی میں

....

وہ خدا ہے مگر اکیلا ہے
جانتا ہے عذاب تنہائی
ایک قطرہ مگر سمندر ہے
کون جانے دلوں کی گہرائی
گر ہدایت ملے ہدایتؔ سے
دور ہو جائے ان سے تنہائی

انسان کی تنہائی ایک ہمہ گیر موضوع ہے جس طرح محبت کے افسانے کی کوئی حد نہیں اسی طرح تنہائی اور اُداسی کا دوسرا کنارہ نہیں۔

دل بھی گویا کوئی جزیرہ ہے
موجزن ہر طرف ہے جس کے گرد
اِک سمندر اُداس لمحوں کا
اور کچھ بے قرار یادوں کا

ہدایت اللہ کی نظم نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ فنی اعتبار سے بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کے شعری مزاج نے کسی کے جامۂ الفاظ و تراکیب کو نہیں اپنایا۔ ان کے ہاں شعر جذبے سے جنم لیتا ہے اور چشمے کی طرح پھوٹتا ہے۔ ہدایت کی شخصیت میں خلوص اور محبت کا عنصر غالب ہے۔ جس کی جھلک ان کے اشعار میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

ہونٹ کھِلتا گلاب ہو جیسے
اور آنکھیں، شراب ہو جیسے
دل کی باتیں ہمیں بتاتا ہے
تیرا چہرا کتاب ہو جیسے
سوہنی دل کی ڈوب جائے گی
دردِ ہجراں چناب ہو جیسے
پھر ہدایتؔ ہے اور تنہائی
اب وہ قربت سراب ہو جیسے

یاد ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان اپنے ماضی کو دیکھ سکتا ہے۔ دل پر چوٹ لگتی ہے تو کسک روح کی گہرائیوں تک محسوس ہوتی ہے جو شعور بن کر حسین یادوں کا روپ دھار لیتی ہے اور انھی یادوں کو محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ محبت جب اپنی ماں سے ہو تو کائنات کی ہر چیز بے معانی ہو جاتی ہے۔ ہدایت اللہ کے اس منہ زور جذبوں نے الفاظ کا روپ دھارا تو ماں جی نظم کی صورت اختیار کر لی۔

گذری کسی بہار کا کھلتا ہوا گلاب
مرجھا گیا جو وقت کی بے مہر ہوا سے
ماضی کے سمندر کی اِک اِٹھلاتی ہوئی موج
جو یاد کے ساحل سے پرے ڈوب گئی ہے
تارہ تھا کوئی ٹوٹ گیا جیسے فلک سے
یا چاند تھا جو چھپ گیا بے وقت گہن سے
گو آنکھ سے اُجھل ہے مگر پاس کہی ہے
کانوں نے کہی بار وہ آواز سنی ہے
انسان تو فانی ہے کرے نکل مکانی
ممتا کو مگر موت کبھی آ نہیں سکتی
مانگی ہے دعاوں میں جو تیرے لیے جنت!
جنت وہی ، اللہ نے چاہا، تو تری ہے

ان کے اشعار قلب واذہان کو منور کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں خیالات کی رفعت بھی ہے اور افکار کا تنوع بھی، مافی الضمیر کے اظہار کی ندرت بھی ہے اور اسالیب کا بانکپن بھی اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر ہدایت نے تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ مقصدیت سے سرِ موانحراف نہیں کیا ہے بلکہ ایسے بہر گام ملحوظ رکھا ہے اور یہی ان کی شاعری کا نکتہ عروج ہے۔

ہدایت اللہ کی شاعری رومانویت، فطرت، محبت اور مدھر نغماتی کیفیت سے ہوتا ہوا غمِ دوراں تک پہنچتی ہے۔ تغزل کے شانہ بشانہ ہدایت کی غزل میں زندگی کی تلخ حقیقتیں بھی بڑے اہتمام سے بیان کی گئی ہیں۔ وہ شاعر دنیائے ادب پر اپنا دیرپا اثر کیسے چھوڑ سکتا ہے جو ان حقائق سے چشم پوشی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ 2010ء میں سیالکوٹ میں پیش آنے والے واقعے پر لکھتے ہیں۔

(زیرِ عنوان: سانحۂ سیالکوٹ)

ظالموں کا ہجوم ہے ہم تم
بے حسوں کا ہجوم ہے ہم تم
زد میں انسانیت کا آئینہ
ٹھوکروں کا ہجوم ہے ہم تم
کوئی مارے کوئی تماشائی
قاتلوں کا ہجوم ہے ہم تم

قوم اب تک نہ بن سکے کیوں کر
منتشر ہیں ، ہجوم ہیں ہم تم
کر ہدایتؔ دعا ہدایت کی
گمراہوں کا ہجوم ہے ہم تم

ہدایت کی شاعری بنیادی طور پر انسان کے داخلی جذبات واحساسات کی شاعری ہے اور یہی عنصر ان کی اثر آفرینی کا باعث ہے۔ ان کے ہاں روز مرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو پوری فکری اور جذباتی گہرائی کے ساتھ عصرِ حاضر کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کے بیان کے حوالے سے متاثر کن پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ہدایتؔ کی شاعری میں یہ سب محسوسات وجذبات "برائے شعر گفتن خوب است" کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ شاعر کی دل کی بھٹی میں تپ کر نمو پذیر ہوتے ہیں۔

لگتی نہیں عجیب کوئی بات بھی یہاں
پہنا دیا کسی نے لبادہ جو دین کا
رہنے دے کند عقل کی شمشیر، تیغ زن!
کٹ جائے گا وگرنہ فسوں ہر یقین کا
خالی رہے نہ میرا یہ سینہ یونہی سدا
اِک روز تو نزول ہو اِس کے مکین کا

....

وہ بچپن ، لڑکپن ،جوانی ، بڑھاپا
یہی چار دن تھی مری زندگانی
میں آغاز ترتیب ہی دے رہا تھا
کہ تقدیر نے ختم کر دی کہانی

زبان کی سادگی جب بیان کی روانی سے ہم آغوش ہوتی ہے تو ہدایتؔ کی غزل کا اصل جوہر نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کی غزل میں نغمگی جوبن پر ہے۔ وہ غزل کو روایتی ڈگر سے نکال کر ایک ایسی شاہراہ پر لے گئے جہاں غمِ جاناں کی آڑ لے کر غم دوراں سے چشم پوشی نہیں کی جاتی۔ زبان وموضوعات کے علاوہ ان کی غزل کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت غنائیت ہے۔

ہدایت اللہ ہدایتؔ کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت عشق ہے۔ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں کا حوالہ ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک عشق ہی ہے جو انسان کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ان کی نظم "عشق" ہے۔

مجازی عشق آساں ہے
نظر کے سامنے محبوب ہوتا ہے
کبھی آواز سن لینا

کبھی ہاتھوں سے چھو لینا
کبھی آغوش میں لے کر
بلائیں اس کی لے لینا......
حقیقی عشق مشکل ہے
نظر کے سامنے کوئی نہیں ہوتا
بس اِک دردِ تمنا
دل کے ویرانے میں رہتا ہے
بہت مشکل ہیں
ایسے عشق کے رستے
جہاں پر ایک تنہا دل مسافر ہو
جہاں پر عشق کی، عاشق کی
اور معشوق کی تفریق ہی نہ ہو
جہاں عاشق ہی خود معشوق ہو
اور عشق بھی خود ہو
بہت آسان ہو جائے
یہ الجھن دور ہو جائے
ہمارا کام بن جائے
اگر عشقِ حقیقی میں
مجازی رنگ آ جائے
ہمیں بھی چاہنے کا ڈھنگ آ جائے

ان کا فن بادلوں میں چمکتی ہوئی دھوپ کرن کی طرح منور ہے۔ ہدایت اللہ کی شاعری الفاظ کی بازی گری نہیں بلکہ امید کی ترویج اور امکانات کی صورت گری ہے۔ ہدایت نے جو غزلیں لکھی ہیں اُن میں سنجیدگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے غزل میں جو زبان استعمال کی ہے، اُس میں لہجے کی رعنائی بھی پائی جاتی ہے۔ ہدایت نے اپنی غزلوں میں بامعنی، سادہ اور انوکھے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ سب سے بڑھ کر انھوں نے قرآن مجید کے الفاظ کا استعمال اپنی غزلوں میں بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ اِن کی غزل کا مطلع انوکھا اور معنی خیز ہے اور مقطع اِن کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔

دھند ہی دھند ہے رستے میں جہاں تک جاؤں
روشنی! تیرے تعاقب میں کہاں تک جاؤں
ضبط کے بند ہدایتؔ میں کہاں تک باندھوں
چشم تر، درد بکف، دشتِ فغاں تک جاؤں

ہدایت نے غزل میں متنوع پیرایہ میں بحروں کا استعمال کیا طویل بحر ہو یا مختصر، اس کو سلیقے سے برتا ہے اور

شاعری میں تجربے کی سطح پر کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس کے اپنے قدرتِ کلام اور قوتِ تخیل پر قائم ہوتی ہے دیکھنا ہوتا ہے کہ شاعر نے زبان کی سطح پر اپنی ان جدت طرازیوں کو جنھیں شاعر نے تخیل اور زور کلام کے ذریعے اکتساب کیا ہے اس میں وہ کتنا کامیاب ہوا۔ دراصل یہ فن کار کی فنی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ کوئی بھی حساس فنکار جو فن پر قدرت رکھتا ہے وہ ان تلازموں کو برملا استعمال کرنے سے نہیں چوکتا۔ ہدایت اللہ نے بھی تجربے کے طور پر اپنی تمام تر شاعری میں فنی مہارت اور چابکدستی کا بھرپور ثبوت دیا۔

⚝⚝⚝⚝⚝

افسانے

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

وقت نے کِیا کیا حسین ستم

گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا اُسے اچھا لگتا تھا۔ جب کبھی طبیعت بے چین ہوتی اور اُداسی ستانے لگتی تو وہ گاڑی نکالتی اور سیدھے سمندر کے کنارے پہنچ کر ننگے پاؤں گیلی ریت پر چلتے چلتے دُور تک پھیلے سمندر کے گہرے نیلے پانی کو دیکھتی رہتی۔ سمندر میں اُٹھتی لہروں کو خاموشی سے دیکھتے رہنا اور پھر اُن لہروں کا کنارے سے ٹکرا کر پلٹ جانا اُسے اپنی زیست کی تصویر لگتی۔ راشد اُسے "پیار کا سمندر" کہتا تھا اور آج وہی سمندر خود تشنگی کی گہرائی میں ڈوب رہا ہے۔ سمندر کی لہروں کی طرح پورا چاند دیکھ کر اُس کی دبی ہوئی خواہشیں سر اُٹھانے لگتیں۔ سمندر کی لہروں میں تلاطم مچلتا، لہریں چاند کو پانے کی خواہش میں بے صبری سے، بے چینی سے مچلتیں، اوپر اٹھتی شور مچاتیں اور پھر ساحل سے ٹکرا کر اپنا سر پٹک کر واپس لوٹ آتیں۔ یہی حال اُس کا بھی ہوتا۔ تنہائی میں اسے گزرے زمانے یاد آتے، اس کی بانہوں کی گرماہٹ، اس کے سانسوں کی مہک، اس کے ہاتھوں کی اٹھکیلیاں، اس کے لبوں کی شرارتیں، اس کے جسم کی خوشبو یاد آتی تو وہ ان لمحوں کے لیے ترس جاتی۔ بیتے لمحے آآ کر اُسے شدت سے اُس کی کمی کا احساس دلاتے رہتے۔ اس کی زندگی انتظار صرف انتظار کی صلیب پر ٹنگی رہتی۔ انتظار کے دن گن گن کر کٹتے اور مقرر وقت سے ایک روز پہلے ہی راشد کا فون آ جاتا۔ ہر بار کوئی نیا مسئلہ ہر بار کوئی نئی بات۔ ہر بار وہ وعدہ کر کے توڑ دیتا اور ہر بار وہ اندر سے ٹوٹ کر بکھر جاتی۔ راشد اس کی کمزوری تھا۔ اس کے علاوہ دنیا میں اُس کا ہے ہی کون؟ اُس کی پوری کائنات راشد کے ارد گرد ہی گھومتی تھی۔ پھر خود کو سمیٹتی، پھر اس کی باتوں کے جال میں پھنس جاتی اور پھر اُس کے آنے کے انتظار میں دن گننا شروع کر دیتی۔ انہیں اداسیوں اور مایوسیوں کے بھنور سے نکلنے کی چاہ میں گیلی ریت پر ٹہل رہی تھی، خود میں سمٹی، اپنے خیالوں کی دنیا میں کھوئی کہ کسی کا ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے چونک پڑی۔ ایک ادھیڑ عمر گٹھیلے جسم، پُر رعب چہرے پر مسکراہٹ بکھیرے شخص اُس سے مخاطب تھا:

"تم غزالہ ہو نا؟"

"جی ہاں! بالکل صحیح پہچانا۔ آپ۔۔۔؟"

"کمال ہے! مجھے نہیں پہچانا؟ ایک ہم ہیں جو تمہیں بھولے نہیں اور ایک تم ہو جسے بھولے سے بھی ہم یاد نہیں۔" اس کی چمکتی مسکراتی آنکھوں سے شرارت جھلک رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ یہ شرارت اُسے بہت پیچھے لے گئی۔

"نلیش شرما" اسے پہچانتے ہی وہ اُچھل پڑی۔

اوہ! "Thank God تمہیں میرا نام تو یاد ہے"

"دوستوں کے نام بھی کوئی بھولتا ہے بھلا! تم یہاں ہوتے ہو؟ میں نے تو سنا تھا کہ کرنل صاحب کشمیر کی

خوبصورتی کے مزے لیتے ہیں۔ رنگین وادیوں نے طبیعت بھی رنگین کر دی ہے"

"غزالہ میڈم سُنا تو تم نے بالکل ٹھیک، اُن حسین وادیوں میں خوبصورت چہروں کو دیکھ کر کون کمبخت دل کو سنبھال سکتا ہے۔ پھر میں ٹھہرا آزاد پرندہ۔ مگر ایک بات بتاؤں میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد پہلی بار جب کسی کو چاہتا ہے تو محبت کرتا ہے دوسری بار بد معاشی اور اس کے بعد صرف عیاشی ہی کرتا ہے۔ اس لیے تم صرف میری پہلی چاہت پر غور کرو، باقی جانے دو۔" یہ سنتے ہی اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔ جھینپ مٹاتے ہوئے وہ جھٹ سے بولی:

"شادی شدہ آدمی آزاد کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا سبھی باتیں یہاں کھڑے کھڑے کریں گے؟ وہ سامنے والی بلڈنگ میں میرا فلیٹ ہے۔ چلو وہاں چلتے ہیں اور اگر کوئی اعتراض ہو تو اس کافی شاپ پر چلتے ہیں۔"

"کافی شاپ چلتے ہیں، گھر کسی اور روز آؤں گی"

ایک عرصے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ کالج کے دنوں کے ساتھی مدت بعد ملے تو بھولی بسری باتیں، دوستوں کے قصے چھیڑ بیٹھے۔ آٹھ لوگوں کا اُن کا گروپ کالج میں کافی مشہور تھا۔ تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔ تین سال سبھی ساتھ رہے پھر گریجویشن ختم ہوتے ہی سب الگ راستوں پر اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے نکل پڑے۔ نلیش شرما فوج میں سکینڈ لفٹننٹ تعینات ہو گیا۔ سبھی جانتے تھے کہ نلیش شرما اس پر فدا ہے مگر اُس نے کبھی زبان سے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا۔ مذہب کی دیوار دونوں کے بیچ حائل تھی جسے توڑنے کی اُس کی مرضی بھی تھی اور ہمت بھی پر اپنی بیوہ ماں کو دُکھ دے کر وہ زندگی کی خوشی حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اکثر وہ یہ گنگنایا کرتا "عشق نہ دیکھے دین دھرم عشق نہ دیکھے ذات"۔ اُس نے اپنے خواب اپنی خواہشیں اپنے اندر ہی دفن کر دیئے۔

"تم نے بتایا نہیں تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"کلپنا سے میری علیحدگی ہو چکی ہے۔ بنٹی کو لے کر وہ اپنے والدین کے پاس کینیڈا میں سیٹل ہو گئی۔ شادی کے صرف پانچ سال ہم نے ایک ساتھ گزارے۔ اس کا اصرار تھا کہ نوکری چھوڑ کر کینیڈا چلوں اور میری ضد تھی کہ نہ میں نوکری چھوڑوں گا نہ اپنا وطن اور نہ ہی اپنی ماں۔ جس ماں کی خاطر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ترک کر دی اُسے بھلا میں کیسے چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ لہٰذا ہمارے راستے الگ ہو گئے۔"

"اور اب یہاں پوسٹنگ ہے؟"

"میں نے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ماں بیمار ہوئی تو اُس نے بستر پکڑ لیا۔ نوکر تو تھے اس کی خدمت کے لیے مگر میں نہیں تھا۔ اُن کے علاوہ میرا اس دنیا میں ہے ہی کون اس لیے نوکری سے ریٹائرمنٹ لے لی"

"اب کیسی ہیں تمہاری ماں؟"

وہ دو منٹ خاموش رہا۔

"اب میں اور میری تنہائی ہے۔ ماں بھی مجبور تھیں۔ میں انہیں بھی نہ روک سکا۔ وقت اور پیسے کا صحیح استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ بے سہارا بزرگوں کے لیے ایک آشرم کھول رہا ہوں۔ تم بھی اس میں میری مدد کر سکتی ہو"۔

وہ خاموشی سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ آج بھی وہ ویسے ہی دلکش ہے، چوڑی پیشانی، سفید اور کالے ملے جلے گھنے چھوٹے چھوٹے بال، ویسی ہی ملے جلے رنگ کی ہلکی ہلکی مونچھیں۔ اس کھلی ہوئی رنگت اور شاداب چہرے کے پیچھے کون جان سکتا

ہے کہ درد اور تنہائی کا سیلاب چھپا ہے جو بات کرتے کرتے اُس کی آنکھوں میں دکھائی دینے لگتا ہے۔

"میں نے تمہیں اپنے بارے میں سب بتا دیا۔ تم بتاؤ کیسی ہو؟ راشد آج کل ادھر ہیں یا اکیلی ہی ہو؟"

"تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟" اس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے دُور چلا گیا تھا مگر تم مجھ سے کبھی دور نہیں گئیں! تمہاری زندگی میں کب کیا ہوا، مجھے سب معلوم ہے"

"وہ کیسے؟"

"جذبے صادق ہوں تو راستے بھی نکل آتے ہیں۔ گھورنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں کئی سالوں سے رجنی سے مسلسل رابطے میں ہوں۔"

"مگر اُس نے تو کبھی مجھ سے تمہارا ذکر نہیں کیا!"

"اسے بھی میرا ایک اور گناہ سمجھو!"

"اوہ! تو وہ مجھ سے زیادہ تمہاری دوست ہے"

"Come on ۔۔۔ غزالہ! میں نے اُسے قسم دے رکھی تھی جس کو اُس نے پوری وفاداری سے نبھایا"

"راشد دو دن بعد آرہے ہیں پھر تم سے اُن کی ملاقات کراؤں گی۔ کافی وقت گزر گیا مجھے اب چلنا چاہیے" وہ یہ کہہ کر اٹھنے لگی تو نلیش نے یک دم سے اُس کا بازو پکڑ کر بٹھا دیا۔

"تمہیں کیا ہوا؟ ایک دم سے بھی کوئی اس طرح جاتا ہے؟ نہ اپنا فون نمبر دیا نہ میرا اتہ پتہ لیا۔ راشد سے کیسے ملواؤ گی مجھے؟"

اُس نے جیب میں سے ملاقاتی کارڈ نکال کر اُسے تھما دیا اس اُمید پر کہ وہ جلد ملیں گے۔

نلیش سے مل کر غزالہ خود کو کافی ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ بہت دنوں بعد اُسے اپنے اندر کی گھٹن سے راحت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ صرف راشد بلکہ ساری دنیا کیا خود سے بھی مایوس تھی، ناراض تھی۔ یہ اس کی شخصیت کی خوبی تھی یا خامی کہ وہ غصّہ بھی ہوتی تھی خفا بھی ہوتی تھی مگر جھگڑا کبھی نہیں کرتی تھی۔ اُسے تو ڈھنگ سے گلہ بھی نہیں کرنا آتا تھا۔ سارا کرب ساری تکلیفیں اپنے اندر خاموشی سے ضبط کر لیتی، اندر ہی اندر جلتی رہتی، کُڑھتی رہتی مگر کسی سے بھی شکایت نہ کرتی۔ راشد اُس کے چہرے کی خاموشی اور آنکھوں میں اُمڈتے اُداسی کے بادلوں کو دیکھ کر سمجھ جاتا کہ اُس کے دل پر غبار چھایا ہوا ہے۔ وہ اکثر اُسے کہتا کہ سب باتیں صاف صاف کہہ دینی چاہیے اس سے دل کا بوجھ کم ہوتا ہے اور دوسرے کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے مگر سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ نہ غزالہ کو گلہ کرنا آیا نہ راشد کو خاموشی کی زباں سمجھنے کا ہنُر آسکا۔

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ نادرا بُوا سب کام نپٹا کر سو چکی تھیں۔ امّاں کے بعد وہ ہی ایک واحد بزرگ تھیں جو اُس کا ہر طرح سے خیال رکھتیں۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا نادرا بُوا کو اس گھر میں پایا۔ ویسے تو وہ خادمہ تھیں مگر اُن کی عزت گھر کے بڑے بزرگ سے کم نہیں تھی۔ دیر رات جب کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی تو اُس نے اٹھ کر راشد کی کتابوں میں سے اُس کے پسندیدہ شاعر احمد فراز کا شعری مجموعہ "جاناں جاناں" اُٹھا لیا۔ آج بھی فراز کی

شاعری راشد کو ویسے ہی سحر زدہ کرتی تھی جیسے جوانی میں۔ یہ اور بات ہے کہ اب تو نہ وہ عمر رہی نہ وہ اُمنگیں، نہ وہ خواہشوں کا تلاطم۔ وہ عمر کے اُس پڑاؤ پر آن پہنچا تھا کہ گزری زندگی کی یادوں کا انبار تو لگا تھا مگر اُن لمحوں کا جادو کہیں کھو گیا تھا۔ پہلے وہ ساون کی بارش کو سوکھا نہیں جانے دیتا تھا اُس کا ہاتھ تھامے بارش میں دُور تک ٹہلتے رہنا اُسے بہت پسند تھا اور اب بارش آتے ہی کھڑکیاں بند کروا دیتا۔

راشد نے ہی اُسے بتایا تھا کہ اگر وہ اُسے اُس روز بارش میں بھیگتے نہ دیکھتا تو شاید وہ ایک ساتھ نہ ہوتے اور نہ ہی اُن کے عشق کی داستان وجود میں آتی۔

وہ بھی ساون کی ایک سہانی شام تھی۔ جب وہ دفتر سے لوٹ کر اپنے کمرے میں فراز کی شاعری میں غرق تھا۔ اچانک بادلوں کے گرجنے کی آواز سن کر اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو کالے کالے بادلوں نے نیلے آسمان پر اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹا ٹوٹ کر برسنے لگی۔ گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چھت پر برستے پانی کا سنگیت اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ایک مدت ہو گئی بارش میں بھیگے ہوئے یہ ہی سوچ کر اُس نے کتاب ایک طرف رکھی اور چھت کی طرف لپکا مگر آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے اس کے قدم ٹھٹھک کر وہیں رک گئے۔ سامنے غزالہ کو بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھ کر وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ خاموش دکھنے والی ہمیشہ سنجیدہ نظر آنے والی لڑکی ایک الگ ہی روپ میں اُس کے سامنے تھی۔ بارش کی تیز و تند بوچھاڑ اُس کے گداز جسم، کتابی چہرے کو ایسے بھگو رہی تھی جیسے تازہ گلاب کے پھول شبنم میں نہائے ہوں۔ وہ دیوار کے سہارے آسمان کی طرف اپنا چہرہ اٹھائے، آنکھیں موندے دھیرے دھیرے کچھ گنگناتی ہوئی بارش کی پھواروں کو ایسے دعوت دے رہی تھی کہ "میں نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیا آؤ آکر میرے رخسار، میری آنکھیں اور میرے لبوں کو اپنے لمس سے سرشار کر دو"۔ وہ آنکھیں بند کئے اُن لمحوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ اس سرشاری میں بھیگتا چلا گیا۔ غزالہ کا بھرا بھرا بھیگا ہوا گداز جسم، کھلی سیاہ گھنی زلفوں سے ٹپکتا پانی اُسے خود سے بھی بے خبر کر گیا۔

وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے لاتعلق، وہی آخری سیڑھی پر ساکت کھڑا رہا مگر اُس کے دل کے چور نے تصور میں ہی آگے بڑھ کر اُس کے بھیگے بھرے بھرے جسم کو بانہوں میں بھر کر اُس کی تپش محسوس کر لی۔ اس سحر زدہ ماحول میں وہ اتنا کھویا کہ یہ بھی بھول گیا کہ ان دونوں کے بیچ پندرہ سال کی گہری کھائی ہے اس کی ایک بیوی بھی ہے ایک چار سال کا بیٹا بھی ہے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا دل کے دروازے کب کھل گئے اور دل کے نہاں خانوں میں خواہش کی ننھی سی کلی چٹکی جس نے اُسے محبت کے جذبات سے آشنا کر دیا۔

ساون میں کھِلی خواہش کی وہ ننھی سی کلی دل ہی دل میں پنپنے لگی، جواں ہونے لگی۔ اُس نے اپنی خواہشوں کو ضبط کرنے کی اُنھیں جکڑنے کی، باندھنے کی بڑی کوشش کی مگر یہ محبت کی خوشبو اُس کی بند مٹھی سے پھسل کر پورے وجود کو تر بتر کر گئی۔ پھر یہ خوشبو بڑھتے بڑھتے اس کے وجود کے حصار سے نکل کر اُس کے ارد گرد ہواؤں میں اپنا جادو بکھیرنے لگی اور یہ بھینی بھینی خوشبو کا احساس غزالہ کو بھی ہونے لگا۔ راشد کا دل اب اُس کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ لبوں کو تو خاموش رہنے کا حکم دے سکتا تھا مگر اس کا دل بغاوت پر اتر آتا اور اُس کی آنکھوں کی چمک سے سب حال بیاں ہو جاتا جس کی شدت سے غزالہ کے سرد جذبات بھی پگھلنے لگے تھے۔ بقول انجان:

عقیدت شرط ہے یاروں محبت اور عبادت میں — یہ جذبہ گر سلامت ہو تو پتھر بھی پگھلتا ہے

زبیدہ بی بی کی تجربہ کار آنکھوں نے اُن کی آنکھ مچولی کا کھیل اور ان کہی کیفیت کو محسوس کر لیا۔

بیٹی کے مستقبل کو لے کر زبیدہ بی بی اُس دن سے پریشان تھیں جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ ہر جوان ہوتی لڑکی کی ماں بیٹی کے لیے فکر مند ہوتی ہے مگر اُس کی فکر کی وجہ قدرت کے فیصلے کو لے کر تھی جس نے اس کی بچی کے ساتھ ناانصافی کر دی تھی۔ وہ اپنے خدا سے ناراض تھی کہ اُس نے اس کی بچی کو اس نعمت سے محروم رکھا جس سے وہ مکمل عورت بن سکے۔ والدین نے کوئی در نہیں چھوڑا چاہے وہ ڈاکٹر ہو، درگاہ ہو، پیر فقیر ہو، کوئی سجدہ کوئی تعویذ کوئی دعا کام نہیں آئی۔ دھیرے دھیرے یہ بات سارے خاندان میں پھیل گئی کہ غزالہ آدھی ادھوری ہے اس میں ماں بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ خاندان سے کسی اچھے رشتے کی انہیں امید تھی ہی نہیں۔ اسی لیے والدین نے اسے تعلیم دلا کر اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ اب انہیں یہ فکر ستانے لگتی کہ اُن کے بعد غزالہ کا کیا ہوگا۔

بیوہ زبیدہ بی بی نے جب راشد کی آنکھوں میں اپنی بیٹی کے لیے چمک دیکھی تو ماں کے دل میں ایک آس کی اُمید جاگی۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ وہ اُس کی بیٹی سے پندرہ سال بڑا ہے، پہلے سے شادی شدہ ہے ایک بچے کا باپ بھی ہے۔ انہیں تو بس اپنی بیٹی کے لیے ایک شریک حیات مل رہا تھا جس کو اُس سے اولاد کی بھی توقع نہ ہو۔

راشد نے غزالہ کو قبول کر کے اپنی خواہش تو پوری کر لی مگر اس کی خبر ملتے ہی ریحانہ نے اُس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ زبیدہ بی بی بیٹی کی ذمہ داری سے فارغ ہو کر حج کی تیاریاں کرنے لگیں اور راشد ریحانہ کو راضی کرنے کی تراکیب سوچنے لگا۔ بار بار وہ یہ دھمکی دے رہی تھی کہ وہ انور کو ساتھ لے کر مائیکے چلی جائے گی۔ انور کی خاطر دونوں میں یہ طے ہوا کہ غزالہ کبھی اُس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔ یہ گھر ہمیشہ اُسی کا رہے گا۔ وہ کبھی خوشی یا غمی میں ایک دوسرے کو نہیں ملیں گے۔ اُس گھر میں غزالہ کا نام لینا اُس کا ذکر کرنا منع تھا البتہ راشد جب بھی اُس کے پاس ہوتا تو اپنی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی بات، ہر خوشی ہر مسئلہ غرض کہ سب کچھ اُس سے بانٹتا۔

جب تک راشد کی پوسٹنگ آدم پور تھی غزالہ کی زندگی بڑی پُر سکون تھی۔ مہینے میں دو دن کے لیے ہی راشد ریحانہ اور انور کے پاس جاتا مگر جب سے اُس کا تبادلہ پُرانے دفتر میں ہو گیا تو اُس کی زندگی میں بھی تبدیلی آگئی۔ دونوں دُور ضرور تھے مگر دن میں کئی کئی بار فون پر موبائل پر بات ہو جاتی کہ دوری کا احساس ہی نہ ہوتا۔ ہر پندرہ دن بعد راشد بیگ اٹھاتا اور غزالہ کے پاس آدم پور پہنچ جاتا۔ آدم پور کا نام سنتے ہی ریحانہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نظر آنے لگتے۔ اس وقت اس کا چہرہ ایسے لگتا جیسے کسی نے زبردستی کڑوی کسیلی دوائی منہ میں ٹھونس دی ہو۔ مگر وہ خاموش رہتی۔

راشد سے نکاح کے بعد بھی غزالہ کی زندگی وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے لیے وقت تھم سا گیا تھا۔ راشد کی خود کی زندگی بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ بڑھاپے کا احساس تو اُسے اپنے بچوں کو جوان ہوتے دیکھ کر ہوتا ہے۔ کہنے کو تو وہ انور کی چھوٹی ماں تھی مگر اپنی اماں کی طرح اس نے بھی کبھی اس رشتے کو قبول نہیں کیا تھا۔

نادرہ بُوا نے چائے کی پیالی اُس کے بستر کے پاس رکھی اور اُس کے قریب ہی بیٹھ کر اُٹھانے لگیں۔ کتاب اُس کی آنکھوں سے لگی تھی۔ شاید پڑھتے پڑھتے سو گئی ہو۔

"بٹیا آج چھٹی ہے کیا؟"

"نہیں بُوا چھٹی کل لوں گی راشد آ رہے ہیں"

"پکی بات ہے ناں!"

"یہ کیا بات ہوئی بُوا۔ کوئی ضروری کام آن پڑے تو دوسری بات ہے وگرنہ اُن کا پروگرام۔۔۔"

"پچھلے تین مہینے سے یہ ہی سن رہی ہوں مگر دولہے میاں ہر بار ضروری کام میں پھنس جاتے ہیں"

"آپ میرا ناشتہ تیار کر دیں مجھے دیر ہو رہی ہے"

یہ کہہ کر اُس نے بُوا کو وہاں سے روانہ کر دیا جو منہ میں نہ جانے کیا بڑبڑاتی نکل گئیں اور وہ سکول جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ دماغ میں بُوا کی باتیں ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں۔

پچھلے تین مہینوں سے راشد آدم پور کا پروگرام بناتا مگر ہر بار کوئی نہ کوئی اڑچن پڑ جاتی اور اُسے پروگرام ملتوی کرنا پڑتا۔ جب جب اُس نے غزالہ کو نہ آنے کی خبر دی تب تب وہ کرچی کرچی ٹوٹتی بکھرتی۔

راشد نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اس کے پاس ہی رہے گا مگر جب وہ ریٹائر ہوا تو انور نے اپنے نئے کاروبار کی ذمہ داری باپ کو سونپ دی۔ راشد کا اپنا پیسہ بھی لگا تھا اس کاروبار میں لٰہذا اُس نے غزالہ کو یہ کہہ کر مطمئن کرایا کہ:

"جوان بچہ ہے ناتجربہ کار بھی ہے۔ اتنا پیسہ لگا ہے خیال تو رکھنا ہی پڑے گا۔ پھر تمہاری نوکری بھی ابھی ہے۔ تم سارا دن سکول جاؤ گی تو میں اکیلا گھر میں کیا کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب جلدی جلدی آیا کروں گا۔"

اس کی یہ بات بھی ماننے کے علاوہ اس کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ راشد کی بٹی ہوئی زندگی سے وہ تھک چکی تھی مگر شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ نکاح سے پہلے ہی اُس نے غزالہ کو سب باتیں کھل کر صاف صاف کہہ دی تھیں۔

"تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے دل میں تمہارے لیے کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میری شادی ریحانہ سے دس سال پہلے ہوئی۔ ریحانہ میری ماموں زاد میری ماں کی پسند اور بچپن کی ساتھی ہے۔ ہماری شادی بچپن میں ہی طے ہو گئی۔ وہ میرے آٹھ سال کے بیٹے انور کی ماں بھی ہے۔ وہ ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں بھی ہے۔

میں بڑی پُرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی زندگی سے مطمئن بھی تھا۔ پھر تبادلہ ہو کر تمہارے شہر آ گیا۔ تم لوگوں کے یہاں کرایہ پر کمرہ ملا تو صرف اپنے کام سے کام رکھا۔ صبح سے شام دفتر اور شام کے بعد اپنی کتابیں اپنا کمرہ۔ چھٹی ہوئی تو گھر کا رستہ دیکھا۔ اُس روز بارش میں تمہیں بھیگتے دیکھا تو میری پُرسکون زندگی میں طوفان آ گیا۔ دل کا دھڑکنا کیا ہوتا ہے، محبت کسے کہتے ہیں، کسی کو چاہنے اور اُسے پانے کی طلب کیسی ہوتی ہے، خواہشوں کا پنپنا پھر ٹوٹ کر بکھرنے کا درد کیا ہوتا ہے، تمہاری چاہت نے ان احساسات سے آشنا کر دیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی ادھوری ہے۔ تمہاری چاہت کے بغیر میں مکمل نہیں۔ تمہیں پانے کی چاہ کو میں مسلسل دباتا رہا۔ اور جب امّاں نے اپنی خواہش کا اظہار دبے لفظوں میں کیا تو میں یہ موقع کیونکر ضائع کرتا۔

جانتا ہوں میں اس وقت خود غرضی کی بات کر رہا ہوں۔ مگر تمہیں بتانا ضروری ہے میں ریحانہ اور انور کو کبھی چھوڑ نہیں سکتا وہ میری ذمہ داری ہیں۔ وہ دونوں کسی بھی صورت ہمارے رشتے کو قبول نہیں کریں گے۔ اس کا ایک ہی راستہ نکلتا ہے کہ تم اپنی نوکری جاری رکھو تو میں دونوں گھروں کی ذمہ داریاں پوری کر سکتا ہوں۔ مگر اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت پڑے گی۔

غزالہ نے پوری وفاداری سے اُس کا ساتھ دیا۔ کبھی اُس کی ذمہ داریوں کے بیچ نہیں آئی۔ ہر لڑکی کی طرح

اس نے بھی چاند ستاروں کی خواہش ضرور کی تھی مگر کبھی اس طرح کی بٹی ہوئی زندگی اُس کے حصے میں آئے گی یہ اُس نے نہ سوچا تھا نہ چاہا تھا۔

راشد سے فون پر دن میں کئی کئی بار بات ہو جاتی مگر اب وہ باتیں بھی بڑی مختصر ہو گئی تھیں۔ وہی گھسے پٹے جُملے "کیسی ہو؟ کیا کر رہی ہو؟ نیا کیا ہے؟" پھر وہی "اور۔۔۔" جیسے اب کوئی اور بات کرنے کو نہیں ہے فون رکھ دیا جائے۔ وہ گزرے لمحے، وہ میٹھی یادیں اور یہ بدلتے حالات، اس کی تنہائی، اس کا اکیلا پن اُسے پریشان کرنے لگتے تھے۔ راشد کی مصروفیت بڑھی تو غزالہ کی تنہائیاں بڑھتی گئیں۔ دھیرے دھیرے اُس کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ جیسے اُسے پہلے محسوس ہوتا تھا کہ راشد اس کے بغیر جی نہیں پائے گا اب اُسے یوں لگنے لگا کہ راشد کی زندگی میں اس کی خاص ضرورت نہیں ہے۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا راشد کی مصروفیت بڑھتی گئی۔ پہلے بیٹے کے کاروبار کا سیٹ کرنا پھر اُس کی شادی کا مسئلہ۔ یہ مسئلہ سلجھ گیا تو شادی کے ہنگامے۔ انور کی شادی میں وہ چاہ کر بھی شریک نہیں ہو سکی۔ راشد نے کہا ضرور کہ "تم کو بھی آنا ہے"۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ماں بیٹا اُسے ایک آنکھ بھی برداشت نہیں کریں گے اور اُس وقت وہ راشد کے لیے کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے انور کو سہرا باندھے دیکھنے کی تمنا دل میں ہی دبالی اور دلہا دلہن کے لیے ڈھیر سارے تحفے خرید کر راشد کے ہاتھ بھیج دیئے۔ ادھر شادی کا ہنگامہ تھا اور ادھر غزالہ اپنی تنہائی کے خول میں دھنستی جا رہی تھی۔ شادی کے بعد جب راشد آیا تو ساتھ میں فوٹو البم بھی لے آیا۔ اس کا تعارف دلہن اور باقی رشتے داروں سے تصویروں کے ذریعے ہی ہوا۔ سب کو خوش دیکھ کر اُسے اپنی محرومیوں کا احساس شدت سے ہوا۔

جلد سے جلد آنے کا وعدہ راشد پورا نہ کر سکا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اب صحت بھی ڈھلنے لگی تھی۔ عمر اپنا رنگ دکھانے لگی تھی۔ دن بہ دن صحت گرتی جا رہی تھی۔ اب وہ سفر سے بھی کترانے لگا۔ غزالہ نے اس سچائی سے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ اس نے اب گلہ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ بدلتے حالات، بدلتی زندگی سے وہ بظاہر سمجھوتہ کرتی رہی مگر اندر سے ٹوٹتی بکھرتی رہی۔ اسے اپنی زندگی اپنا وجود بے مقصد بے معنی لگنے لگا۔

اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ رشتوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ کبھی وہ وقت بھی تھا جب اُن کے رشتے میں بچپنا تھا جب وہ ایک دوسرے کو دیکھے بنا ایک دن بھی رہ نہیں سکتے تھے۔ پھر اُن کا رشتہ جوان ہوا تو راشد کو بھاگتے لمحوں سے ہمیشہ گلہ رہتا اُسے یہ شکایت رہی کہ "نہ جانے کیسا جادو کر دیا ہے تم نے کہ نہ ہاتھ تھکتے ہیں، نہ لب تھکتے ہیں اور نہ دل بھرتا ہے" اور اب شاید شباب کے دور سے نکل کر اُن کا پیار بھی اُس کی طرح پیری کی دہلیز پر جا پہنچا ہے۔ ناتواں جسم کی طرح اس کے جذبات، اس کے احساسات، اس کی ضرورتیں بھی سرد پڑ گئی ہیں۔ مگر یہ ایک ایسی سچائی تھی جسے وہ قبول کر چکی تھی۔ سچائی تو یہ بھی تھی کہ اُسے آج بھی راشد کی ضرورت تھی۔ اُس کے ساتھ کی، اس کے پیار کی۔ مرد کا پیار دل سے شروع ہوتا ہے اور عورت کے جسم کو پالینے کے بعد وہ سمجھتا ہے کہ اس نے عورت کا پیار پالیا وہ پُرسکون ہو جاتا ہے جبکہ عورت مرد کے جسم سے پرے اس کے ذہن و دل پر اپنا قبضہ اپنی ملکیت جمائے رکھنا چاہتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ بے چین ہو اُٹھتی ہے۔ اور اب غزالہ کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ راشد کے دل و ذہن پر اُس کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اُسے چاہے جانے والی شدت اب اُسے محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس شدت کے لیے ترس رہی تھی تڑپ رہی تھی۔ یہ سحر شاید اس کی زندگی سے گزر چکا تھا کبھی نہ لوٹنے کے لیے جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی یا پھر نظر انداز کر رہی

تھی اسے قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دوپہر کو وہ سکول سے لوٹی تو ڈھیر سارا اسامان بھی ساتھ تھا۔ آتے ہی نادرہ بُوا کو تھما دیا۔

"بُوا کل سے میں دس دن کی چھٹی پر ہوں۔ آپ کو سارا اسامان لا دیا ہے اب بس راشد کے پسندیدہ کھانے کی تیاریاں کر لیں کہ کس روز کیا بنے گا" اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ راشد نے فون پر بتایا تھا کہ صبح سات بجے ہی چل پڑے گا اور بارہ بجے تک پہنچ جائے گا۔ اس بار وہ جلدی جانے کے لیے نہیں آ رہا۔

"اطمینان سے رہوں گا اور جب اجازت دو گی تبھی جاؤں گا" یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ پہلی بار اُس نے بھی دھمکی دی تھی "اگر اس بار بھی تم نہ آئے تو قسم سے میں اپنا وعدہ توڑ دوں گی اور خود چلی آؤں گی وہاں۔ ساری عمر تمہاری باتیں سُنتی آئی ہوں اب نہیں سُنو گی۔ بیوی ہوں تمہاری دُنیا کے سامنے نکاح کیا ہے بھگا کر نہیں لائے .خاموشی سے سب برداشت کرتی رہوں"۔

"میں تمہیں موقع ہی نہیں دوں گا کہ تمہیں اپنے وعدے سے مکرنا پڑے"

غزالہ نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر راشد ہمیشہ کے لیے اُس کے پاس رکنے کو تیار ہو جائے تو وہ نوکری چھوڑ دے گی۔ اب وہ دل میں کوئی بات نہیں رکھے گی۔ ہر بات، ہر جذبہ اس پر ظاہر کر دے گی۔ اس بار تو وہ اس کی ایک نہ سنے گی وہ چاہے کتنا ہی منع کرے۔ اُسے بارش میں ٹہلنے ضرور لے جائے گی۔ بارش میں راشد کے ساتھ بھیگنے کا سرور ہی کچھ اور ہے۔ رات دیر تک وہ گھر کو سجانے سنوارنے میں لگی رہی۔

صبح فون کی گھنٹی کی آواز سُن کر اُس کی نیند کھلی۔ اُس نے گھڑی دیکھی آٹھ بج چکے تھے۔ اتنی دیر تک تو وہ کبھی بھی نہیں سوتی۔ بُوا نے بھی نہیں اٹھایا۔ اس نے یہ ہی سوچ کر فون اٹھایا کہ راشد کا فون ہو گا؛ بتانے کے لیے کہ چل چکا ہے۔ ہیلو کی تو دوسری طرف نلیش شرما تھا۔

"سب خیریت اتنی صبح صبح فون؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"غصہ کیوں ہوتی ہو۔ میں نے تو یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں جس آشرم کی تم سے اُس روز بات کر رہا تھا۔ دو بزرگ تو رہنے کو آ بھی گئے۔ اگر تم کچھ وقت نکال سکتیں تو اس کے بارے میں بیٹھ کر بات کر لیتے۔

"نلیش سُنو! آج راشد آ رہے ہیں۔ پہلے میں اُن سے بات کروں گی پھر آگے کی کچھ سوچوں گی۔ ابھی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں بعد میں بات کرتے ہیں"

"جیسے تم ٹھیک سمجھو" اس کی مایوسی غزالہ سے چھپی نہ رہ سکی

ابھی وہ فون رکھ کر مڑی ہی تھی کہ پھر گھنٹی بج گئی۔

"ہیلو"

"غزالہ میں بول رہا ہوں۔ فون بہت Busy آ رہا تھا؟"

"یہ بتاؤ کہاں پہنچے؟" اس نے اُس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا سوال داغ دیا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا۔۔۔" وہ بولتے بولتے ہکلانے لگا

غزالہ کا دل ایک دم سے بیٹھ گیا۔

"غزالہ تم سن رہی ہو ناں؟"

"بولو"

"صبح ہی ریحانہ کی طبیعت خراب ہو گئی اُسے لے کر ہسپتال آیا ہوں"

"کیا ہوا؟"

"سینے میں درد کی شکایت کر رہی تھی۔ ابھی تو ٹھیک ہے ڈاکٹر کہہ رہے ہیں گھبرانے کی بات نہیں پر سبھی ٹیسٹ کروانے پڑیں گے "اس نے اتنا سنتے ہی اُس نے فون رکھ دیا۔ ایک بار پھر راشد وعدہ کر کے نہیں آئے۔

ایک بار پھر اُس کے خواب کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے۔ بس اب اور نہیں۔ وہ اپنی باقی زندگی اس طرح انتظار کی صلیب پر لٹک کر نہیں کاٹ سکتی۔ وہ اب آدھی ادھوری زندگی بسر نہیں کرے گی۔ یا تو اُسے سب کچھ چاہیے یا کچھ بھی نہیں۔ فون کی گھنٹی لگاتار بج رہی تھی، نادرہ بُوا کچن سے کہہ رہی

اُٹھی۔ ثابت قدموں سے آگے بڑھی۔ پانچ منٹ میں تیار ہو کر گاڑی نکال کر گھر سے باہر تھی۔ اُس کا ذہن اُس کی گاڑی سے تیز بھاگ رہا تھا اور گاڑی سمندر کی طرف سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی مگر یہ وہ ہی جانتی تھی کہ یہ گاڑی نلیش کے فلیٹ کی طرف جا رہی ہے یا راشد کے شہر یا پھر ہر بار کی طرح اس کے ننگے پاؤں گیلی ریت سے لپٹ کر لوٹ آئیں گے!!

❂❂❂❂❂

مطلوب الرسول قمر

وہ دونوں!

اصولاً تو ان دونوں کا لباس اور ہیئر سٹائل ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہونا چاہیے تھا۔ جوتے بھی کپڑوں کی مناسبت سے ٹھیک تھے۔ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بیگ بھی جدید فیشن سے لگا کھا رہے تھے۔ چلنے کے انداز میں بھی ایک حد تک اعتماد تھا۔ لیکن ان کے چہروں اور آنکھوں کے کچھ رنگ ایسے تھے جو دیکھنے والے کو ابھرتی رات کی مصنوعی روشنیوں میں بھی اپنی طرف متوجہ کرتے اور چونکاتے تھے کیونکہ یہ رنگ نہ تو ان کے لباس سے مطابقت رکھتے نہ بالوں کی تراش خراش سے اور نہ ہی جوتوں اور بیگ سے۔ لیکن ایک تو رات کا وقت پھر بازار کی گہما گہمی، ہر کوئی اپنے آپ میں مگن، اپنی دنیا میں مست، کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ ضرورت، ہر چہرہ دوسرے کے لیے ناشناسا، یہ کون سا کسی قصبے کا بازار تھا جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور سرِ بازار ایک دوسرے کا نہ صرف حال دریافت کرتے ہوں بلکہ خاندانی حالات بھی زیرِ بحث لاتے ہوں۔ یہ تہذیبِ نَو کا علمبردار، شہر کا جدید ترین بازار تھا جہاں ایک دوسرے کی طرف دیکھنا بھی اَن- سویلائزڈ ہونے کی علامت ہے۔ سو، اُن دونوں کی آنکھوں میں جھانکنے کی کسے فرصت!

لیکن میرے ساتھ معاملہ ذرا مختلف ہے۔ میں اکثر کہانی کی تلاش میں شام کے وقت باہر نکل جایا کرتا ہوں۔ کیونکہ کہانیاں اور کردار ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں، بس انہیں تلاش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ناں کہ گاہک اور موت کا کچھ پتا نہیں ہوتا، کب آجائے۔ میں اس میں کہانی کا اضافہ بھی کرتا ہوں۔ کیا پتا کہاں، کس موڑ پر کہانی مل جائے۔ سو کہانی کار کو ہر وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔ کہانی کار کی آنکھیں کتے کی ناک کی طرح ہوتی ہیں۔

اس دن میں کہانی کی تلاش میں نہیں بلکہ اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ کچھ ضروری خریداری کے لیے بازار میں گھوم رہا تھا۔ بہت کچھ خرید لینے کے بعد جب جسم نے توانائی کی طلب کی تو بیگم کی نظر جنگلے کے ساتھ گول گپوں کے ایک سٹال پر رک گئی۔ ابھرتی رات، جگمگاتا بازار، ہاتھوں میں خریداری کے تھیلے اور شوہر ساتھ ہو تو عورت گول گپوں پر لٹو ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا ہم نے نسبتاً ایک نیم تاریک گوشے میں دو کرسیوں پر قبضہ کر لیا۔ بیٹھتے ہی جسم سے چنگاریاں سی پھوٹیں تو ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیے۔

"جی حضور! گول گپے، دہی بھلے یا فرائز؟" میں نے شریر لہجے میں بیگم سے پوچھا۔

"گول گپے" انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"ایک پلیٹ گول گپے دینا" میں نے دوکان دار کو آواز دی جو بڑی مہارت سے گول گپے تیار کر کے گاہکوں کو دے رہا تھا۔

"اچھا صاب" اس نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے سامنے گول گپوں کی پلیٹ اور دو پیالیوں میں ٹھنڈا ٹھار کھٹا پانی حاضر کر دیا گیا۔ ہم ان سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ خریداری پر بھی تبصرہ کر رہے تھے اور باقی ماندہ خریداری کی منصوبہ بندی بھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ رہی تھی۔ ہمارے ارد گرد پڑی اکثر میزوں پر لوگ بیٹھے اپنی من پسند اشیاء سے محظوظ ہو رہے تھے۔ کچھ میزیں ابھی خالی بھی تھیں۔ ہم گول گپوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد کرسیوں کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے کہ وہ دونوں، گول گپے والے کے پاس آئیں۔ ان میں سے ایک نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا :

"گول گپوں کی پلیٹ کتنے کی ہے؟"

"ایک سو بیس روپے کی" دکاندار نے مختصر جواب دیا۔

میں ایک دم سے چونکا۔ میری آنکھوں نے شاید کچھ سونگھ لیا تھا۔

اس لڑکی نے اپنے بیگ کو کھول کر اندر ہی اندر کچھ ٹٹولا، جیسے وہ زندگی کو ٹٹول رہی ہو۔

"آدھی پلیٹ مل سکتی ہے؟"

میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ میں نے بیگم سے باتیں کرتے ہوئے اپنی توجہ ان دونوں پر مرکوز کر دی۔

"جی ہاں" دکاندار نے جواب دیا۔ وہ دونوں ایک خالی میز دیکھ کر بیٹھ گئیں۔ میں وہاں مزید کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا لہذا بیگم سے کہا :

"شکر قندی بھی کھانی چاہیے۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ" بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن ایک شرط پر" میں نے کہا

"ہم ہر شرط پر کھائیں گے۔" بیگم نے فاتحانہ انداز سے کہا۔

"آرڈر آپ دینے کے لیے اٹھیں گی" میں نے مصنوعی تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ ایسی کون سی بات ہے۔ یہ لیجیے" یہ کہہ کر وہ شکر قندی والے کے پاس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

دراصل میں اپنی نظریں ان دونوں پر مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔

اتنی دیر میں ان کے سامنے پانچ گول گپوں کی آدھی پلیٹ آ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں پلیٹ پر مرکوز کر دیں جیسے آدھے لمحے میں ہی دونوں نے کسی معاہدے پر دستخط کر دیے ہوں۔ میں اب یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ ان گول گپوں کو آپس میں برابر کس طرح تقسیم کرتی ہیں۔ سارا مسئلہ تقسیم ہی کا تو ہے۔

اسے اتفاق کہیے یا میری خوش قسمتی کہ ان کی میز کا زاویہ ایسا تھا کہ میں دونوں کو برابر دیکھ سکتا تھا۔ جب دونوں نے دو دو گول گپے کھا لیے تو میرے دل کی دھڑکن کچھ بڑھ گئی۔ میری آنکھوں میں انتظار کے ساتھ ساتھ حیرت کے سائے بھی لہرا رہے تھے اور پھر اگلے ہی لمحے یہ حیرت خوشگواری میں بدل گئی۔ جس لڑکی نے بیگ کو ٹٹولا تھا اس نے ہاتھ ٹشو پیپر سے صاف کیے اور پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

میں شکر قندی کھاتے ہوئے بھی ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں ایک ہی طرف مسلسل دیکھنے کی وجہ

سے بیگم کی نسوانی حس جاگ اٹھی اور انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں بیٹھی ہوئی دو فیشن ایبل لڑکیوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بیگماتی چنگاریاں جل اٹھیں تو میں نے فوراً بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بیگم فوراً معاملے کی سنگینی کا احساس کر کے خاموش ہو گئیں کیونکہ کئی مرتبہ ایسے موقعوں پر ہمارا آمنا سامنا میری شاگردوں سے ہو چکا ہے۔

اس اثنا میں وہ دونوں پیسے ادا کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں اور ساتھ ہی آلو کے چپس بنانے والے ٹھیلے کی طرف بڑھیں۔ میں نے فوراً بیگم سے کہا کہ جلدی سے جاؤ اور چپس خریدنے کے بہانے دیکھو کہ وہ لڑکیاں کتنے کی چپس لیتی ہیں۔

میں نے بھی سامان اٹھایا اور بیگم کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ٹھیلے تک جا پہنچا۔

"آدھا ڈبہ" اسی لڑکی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کھلی روشنی میں ان کا سراپا میرے سامنے تھا۔ دونوں کی عمریں تھوڑی بہت اونچ نیچ کے ساتھ بیس کے قریب تھیں۔ نقوش دلکش، جنھیں ہلکے میک اپ نے دلآویز بنا دیا تھا۔ لباس کی تراش خراش بھی عمدہ، بال سلیقے سے ترشے ہوئے، دیکھنے میں کسی بھلے گھر کی معلوم ہوتی تھیں لیکن آنکھوں میں بے یقینی کے سائے کوئی الگ ہی کہانی سنا رہے تھے اور مجھے اسی کہانی سے دلچسپی تھی۔

میں نے ان کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سو میں نے بیگم کو ہلکی آواز میں سارا قصہ بتا کر انھیں کہا کہ یا تو باقی خریداری خود کر کے ٹیکسی لے کر گھر چلی جائیں یا پھر خریداری مؤخر کر کے گھر چلی جائیں۔ مجھے نہ جانے کتنی دیر تک گھر سے باہر رہنا پڑے اور کہاں تک جانا پڑے۔ بیگم نے خریداری کو موخر کیا اور کیب منگوا کر گھر روانہ ہو گئیں۔

بیگم کی طرف سے بے فکر ہو کر میں نے اپنی ساری توجہ ان دونوں پر مرکوز کر دی۔ وہ دونوں ٹہلنے کے انداز میں چل رہی تھیں اور راستے میں آنے والی ہر چیز کا رک رک کر جائزہ لیتی جا رہی تھیں۔ میں ایک مناسب فاصلے کے ساتھ ان کے پیچھے ہو لیا اور بظاہر خود کو ان سے لاتعلق کر لیا۔ لیکن میری آنکھیں اور کان انھیں کی طرف تھے۔ ابھی تک کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی جس نے مجھے چونکایا ہو یا متوجہ کیا ہو سوائے اس کے کہ وہ دونوں لاشعوری طور پر ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد کلائی پر بندھی گھڑی سے وقت ضرور دیکھ لیتیں۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے کسی جگہ رک کر بھی کچھ وقت گزارا۔ رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی اور وہ بازار کے مصروف حصے سے نکل کر نسبتاً کم مصروف حصے میں آ چکی تھیں۔ یہاں پہنچ کر اتنا ہوا کہ ان کی آواز میرے کانوں تک پہنچنے لگی اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا اکثر حصہ مجھے سنائی دینے لگا۔

"میں سوچ رہی ہوں ہمیں خود کو تھوڑا سا بولڈ کرنا پڑے گا"۔ جس لڑکی نے پیسے ادا کیے تھے اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، ہمیں اپنی ڈیمانڈ کچھ بڑھا دینی چاہیے" دوسری لڑکی نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"اگر وہ ہماری مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں تو ہمیں بھی ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہیے"۔ میں چونکا۔ ایک دم بہت سے سانپوں نے میرے اندر پھن پھیلا دیئے۔ کیا یہ جسم فروش لڑکیاں ہیں؟ میرے ذہن نے مجھ سے سوال کیا۔ حلیے اور چال ڈھال سے تو ایسا بالکل نہیں لگتا۔ میں نے خود کو جواب دیا۔ آجکل لوگوں نے اپنے آپ کو اس طرح سے چھپایا ہوا ہے کہ کچھ پتا نہیں چلتا۔ میرے اندر سے ایک اور آواز آئی۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس طرح کی لڑکیوں کو دیکھ کر

تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں نے بھرپور دفاع کرنے کی کوشش کی۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ ماننے میں تامل ہو رہا تھا کہ وہ جسم فروش نہیں ہیں۔ ان کی آنکھوں میں لہرانے والے سائے کچھ اور تاثر دے رہے تھے۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اتنا تو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کا تعلق کسی عام یا درمیانے گھرانے سے ہے۔ لیکن ایسی کیا وجہ ہے کہ دونوں اس وقت تک جب کہ رات کے گیارہ بجنے والے تھے، یوں گھوم رہی ہیں۔ فی الوقت ان سوالوں کے جواب ملنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا میں ان کے پیچھے پیچھے ہی چلتا رہا۔ جب میں نے دیکھا کہ ان کی رفتار قدرے تیز ہو گئی ہے تو میں نے جلدی سے پارکنگ میں سے اپنی بائیک نکالی اور مین روڈ پر آ کر ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ان دونوں نے ایک رکشے والے کو روک کر کچھ بات چیت کی، پھر رکشے میں سوار ہو کر چل دیں۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ رکشہ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا شہر کے ایک پوش علاقے میں پہنچ گیا اور ایک چوک پر انھیں اتار کر آگے بڑھ گیا۔ انھوں نے اتر کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر سڑک کے کنارے چلتے ہوئے نسبتاً کم مصروف حصے میں پہنچ کر رک گئیں۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔۔۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔۔۔۔ میرے اندر ایک قہقہ گونجا۔ لو! دیکھ لو ان پارساؤں کو، تم تو کہتے تھے کہ یہ جسم فروش نہیں ہو سکتیں، دیکھو۔۔۔۔! دیکھو! یہاں کھڑے ہونے کا مقصد کیا ہے؟ بولو۔۔۔۔! اب بولتے کیوں نہیں؟۔۔۔۔ مجھے ان سے گھن سی آنے لگی۔ وہ دونوں آپس میں ایک مناسب فاصلہ رکھ کر سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئیں۔

میں نے بھی اپنی بائیک اندھیرے میں اس طرح کھڑی کر دی کہ میں تو ان کو نظر نہ آؤں لیکن ان کی کوئی حرکت مجھ سے پوشیدہ نہ رہے۔ میں اندر ہی اندر خود سے بھی شرمندہ ہو رہا تھا کیونکہ میں بظاہر اپنے آپ سے ہار گیا تھا لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ نہ جانے کیوں مجھے اب بھی لگتا تھا کہ حقیقت، حقائق سے مختلف ہے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور سفید رنگ کی ایک گاڑی ان میں سے ایک کے پاس آ کر رکی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے مخالف سمت والی کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔ میرا خیال تھا ابھی دروازہ کھلے گا اور وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ جائے گی۔ لیکن یہ کیا! میرے اندر ایک دم ایک آئینہ آن کھڑا ہوا۔ اس نے بغیر دیکھے نفی میں سر ہلا دیا اور رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اس آدمی نے تھوڑا سا انتظار کیا شاید کچھ کہہ بھی رہا ہو گا لیکن فاصلہ زیادہ ہونے اور کار کی وجہ سے مجھے سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا اور پھر کار بڑھا کر دوسری لڑکی کے پاس رک گیا۔ وہاں بھی یہی منظر دہرایا گیا۔

میں اپنے اندر جھانک کر مسکرایا تو ایک طنزیہ قہقہہ بلند ہوا: ارے میاں! اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو پہلی گاڑی رکی ہے، بس تم دیکھتے جاؤ۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور کار آ کر رکی اور پھر وہی انکار۔ چند بار جب یہی منظر دہرایا گیا تو مجھے اپنی فتح یقینی نظر آنے لگی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بے چینی بھی بڑھتی گئی کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

میں اسی شش و پنج میں تھا کہ ایک اور کار آ کر اس کے قریب رکی، ڈرائیور کی مخالف سمت والا شیشہ نیچے ہوا۔ لیکن اس بار لڑکی نے یک لخت انکار نہیں کیا بلکہ بات چیت شروع ہو گئی۔ میرے اندر ایک دم چھناکا ہوا۔ اب کے مجھے اپنی شکست واضح نظر آ رہی تھی۔ لیکن جب میں نے غور سے دیکھا تو ایک دم میرا دل اچھل پڑا۔ گاڑی میں کوئی مرد

نہیں بلکہ ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی اور دونوں کے درمیان بات چیت چل رہی تھی۔ ظاہر ہے فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے میں گفتگو تو نہیں سن پا رہا تھا لیکن لڑکی کے چہرے کا اطمینان گفتگو کی چغلی کھا رہا تھا۔ میں ابھی اس ساری صورتحال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس لڑکی نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی مدھم سی آواز آئی اور میرے اندر کئی دروازے کھل گئے۔

۞۞۞۞۞

رتن سنگھ

سیالکوٹ کا لاڑا

میں نے اپنی لاڑی کو بچپن میں اس وقت چن لیا تھا جب میں ماں کا دودھ پیتا بچہ تھا اور وہ لاڑی تھی ایک گوگلیانی۔

پنجاب میں گوگلیانی، راجستھان کی ان عورتوں کو کہتے ہیں جو گلی گلی، گھر گھر، سوئیاں اور کند ھوئیاں بیچا کرتی ہیں۔ یہ سوئیاں، کند ھوئیاں بیچتے ہوئے انہوں نے اپنے پکے ججمان بھی بنا رکھے ہیں۔ اپنے ججمانوں کے گھروں میں نئے بچے کی پیدائش پر لوریاں، شادی ہونے پر گھوڑیاں اور دوسرے خوشی کے گیت گایا کرتی ہیں، کوئی افسوس کا موقعہ ہو، وہ بین کے دردناک گیت گا کر اپنے ججمانوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتی ہیں۔ میری پیدائش کے موقع پر بڑی گوگلیانی مر گئی تھی، اس لیے اس کی چودہ پندرہ سال کی بیٹی میری لوری کے گیت گانے آئی:

گوگیلانی گاوے لوری
کاکا لمبڑی عمریا توری
اونچ اٹریا جو تو جائے
تجھ کو دنیا سیس نوائے
تیرا اونچا ہو اقبال
امبڑی لامصری کا تھال
گوگلیانی گاوے گھوڑی
لاڑا لاڑی بڑھیا جوڑی
جو تو بیاہ کرنے کو جائے
کوئی اپسرا بیاہ کر لائے
تیری چاچی ہوئے نہال
چاچی لامصری کا تھال
کاکا بلاں وچ مسکائے
دادی پیلاں پاندی آئے
متھا چمے مرچاں وارے
دادی پوتے توں بلہارے

اس کا مکھڑا سوہا لال
دادی لا مصری کا تھال

میری ماں بتایا کرتی تھی کہ مجھے گود میں لے کر، گوگلیانی اپنی باریک لمبی آواز میں جب یہ لوری گا رہی تھی تو پتہ نہیں کب میں اس کے دودھ کو منہ میں ڈال کر چپل چپل پینے لگا۔ میں دودھ پی رہا تھا اور شرم کے مارے گوگلیانی کا چہرہ لال انار ہوتا جا رہا تھا۔

دادی نے جب مصری کے بھرے ہوئے تھال کے اوپر پانچ روپے رکھ کر گوگلیانی کی جھولی میں ڈالے تو بولی، ''لے میں نے تجھے مصری کھلا دی تو بھی ماں بننے والی ہے، تو بھی مجھے مصری کھلانا۔ گوگلیانی نے شرم کے مارے مجھے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا اور جب وہ مجھے ماں کی گود میں ڈالنے لگی، میں واپس جا ہی نہ رہا تھا۔ اتنی اچھی لگی تھی مجھے گوگلیانی۔

جب میں کچھ بڑا ہوا تو گوگلیانی کی انگلی تھامے میں گلی گلی گھوما کرتا تھا۔ وہ سوئیاں اور کندھوئیاں بیچتی رہتی اور میں اس کے غرارے یا رنگ دار چنری کو تھامے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ جب وہ کسی کی لوری گاتی تو مجھ پر وجد کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے اپنے کانوں میں اس کی میٹھی آواز کا رس گھولتا رہتا۔ لوگ مذاق میں اس سے پوچھتے کہ یہ تیرا کون لگتا ہے تو وہ ہنس کر کہتی: ''یہ میرا لاڑا ہے۔''

رہی میری بات تو میں تو کہتا ہی تھا کہ یہ میری لاڑی ہے۔ میرا جواب سن کر لوگ ہنستے اور میری لاڑی کا رنگ چنبے کی طرح کھل اٹھتا۔

میرے ذہن میں اپنی اس لاڑی کی جو تصویر محفوظ ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔ کنوئیں کی طرح گہری، ٹھوڑی کے اوپر شعلوں کی طرح دہکتے دو تراشے ہوئے ہونٹ، ان کے اوپر لٹکتی تیکھی پتلی تلوار سی ناک، اس ناک پر رکھی ہوئیں کٹار سی بڑی بڑی آنکھیں جن کے اوپر کالی بھنویں اس طرح جھکی رہتیں جیسے آنکھوں کی خوب صورتی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے ماتھے کے عین بیچ و بیچ بالوں کے چیر سے لٹکتی ہوئی چاندی کی زنجیر کے سہارے ایک ٹیکا جھولتا رہتا تھا۔ سر کے بیچ و بیچ چوک پھول اور اس چوک پھول کی اونچی ٹیسی پر اٹکا ہوا اس کی گہرے رنگ کی ساڑھی یا دوپٹے کا پلو، جو اس کے لمبے چہرے کو اپنے ہالے میں لیے رہتا تھا اور اس کی چنری کے رنگ کی دمک اس کے گورے رنگ پر پڑتی ہوئی کوئی ایسا جادو جگاتی جیسے قوس قزح کے ساتوں رنگ اس کے چہرے پر نکھر آئے ہوں۔

پھر اس کے ہاتھوں سے لے کر کہنیوں تک اور کہنیوں سے لے کر کندھوں تک سفید، لال اور ہرے رنگ کا چوڑا بازوؤں کی ذرا سی حرکت سے جھنجھنا اٹھتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے چھاکے والے کنوئیں کی اونچی نشار کا پانی ''اولو'' میں گرتا ہوا میٹھا گیت گا رہا ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بچپن میں، میں اس کی گود میں بیٹھ کر اس کی چمکی ہوئی چولی میں ٹنکے چھوٹے چھوٹے شیشوں میں اپنا چہرہ دیکھا کرتا تھا۔ چہرہ دیکھتا اور اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیاں ان شیشوں پر مار مار کر کہا کرتا تھا: ''میں یہاں بھی ہوں، میں یہاں بھی ہوں۔''

''میرا لاڑا تو میرے دل میں رہتا ہے۔'' وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچ کر کہتی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ بچپن کے دن بہت پیچھے رہ گئے۔

آخری مرتبہ جب میں نے اپنی لاڑی کو دیکھا تب میں چودہ پندرہ سال کا بھرپور جوان ہو گیا تھا۔ جوان، لمبا چوڑا، چھ فٹ سے نکلتا قد، سر پر کلف لگی پگڑی باندھ کر میں پورا مرد لگتا تھا۔ اس بار جب وہ آئی تو میرے بڑے بھائی کی

منگنی ہوئی تھی اور اس کی سر بال سے بڑے بڑے موتی چور کے لڈو آئے تھے۔ ایک ایک لڈو پاؤ پاؤ بھر کا تھا۔ اتنا موٹا کہ میرے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں نہ سماتا تھا۔ ہمارے گھر کے کھلے چوڑے آنگن میں گوگلیانی بدھائی کا گیت گا رہی تھی:

ہوئی منڈے دی کڑمائی
گوگلیانی دئے بدھائی
دوہٹی بیٹھی پیڑا ڈاہ کے
گل وچ ہار ہمیلاں پا کے
اس کی گود میں کھیلے بال
امبڑی لا مصری کا تھال

گوگلیانی گا رہی تھی، ناچ رہی تھی۔ ناچتی ہوئی جب وہ تیزی سے چکر پر چکر کاٹتی تو اس کا کھلا گھرا، چھتری کی طرح پھیل جاتا اور اس کے دوپٹے، اس کی چولی میں ٹنگے رنگ برنگے شیشوں سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹتی رہتیں۔

اس موقع پر سب خوش تھے۔ سب اس کے تال میں تال ملا کر تالی بجا رہے تھے۔ اس تالی میں اگر کسی کے ہاتھ نہیں اٹھ رہے تھے تو میرے۔ میں اداس تھا۔ میرا بچپن بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس لیے گوگلیانی کی انگلی تھامے اس کے ساتھ نہیں گھوم سکتا تھا۔ اب میں اس کے ڈیرے میں جا کر اس کی گدڑی کے نرم اور گرم بستر میں اپنی لاڑی کے سینے سے لگ کر نہیں سو سکتا تھا اور ابھی میں پورا مرد بھی نہیں بنا تھا کہ کھل کر اس سے اپنے عشق کا اظہار کر دوں۔ میں تو ابھی سوچ رہا تھا کہ وہ میری لاڑی ہے اور اب سر پر کلف دار پگڑی باندھے، پورا مرد بننے کی کوشش کے باوجود مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے لاڑی کے سینے سے لگ کر جو سکھ مل سکتا ہے، اسے کیسے حاصل کروں۔

اس کا ناچ جاری تھا۔ اس کے گیت کی باریک دھن اب بھی میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی اور اس رس کا نشہ دھیرے دھیرے میرے وجود پر چھا رہا تھا لیکن مجھے مکمل سرشاری نہیں مل رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے بڑے ہونے کے ساتھ ہی میری لاڑی مجھ سے دور ہو گئی ہے۔ شاید اسی لیے اس نے ابھی تک میری آنکھوں میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ پہلے کی طرح اپنے سینے سے لگا کر مجھ سے پیار نہیں کیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میں بار بار اپنے بچپن میں لوٹ جاتا لیکن لاڑی کے جسم سے نکلتی کرنوں کی رنگینی مجھے واپس آنگن میں لے آئی۔

میری اداسی کو شاید گوگلیانی نے بھی بھانپ لیا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ ناچتے ناچتے کب اس کا بازو کوند کر لپکا۔ مجھے تو تبھی پتہ چلا جب اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے آنگن کے بیچ و بیچ کھینچ لیا اور مرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، میرے جوان چہرے کے دونوں طرف ناگن کی طرح سر گھماتے، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال اس نے گیت کا مکھڑا اٹھایا:

میرا لاڑا کھڑا اداس
میں تو جاتی اس کے پاس
میری دولت اس کا پیار
اپنی جان میں کروں نثار

یہ تو میرا قیمتی لعل

امبڑی لا مصری کا تھال

گیت جاری تھا۔ لاڑی میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گدے کی تال میں ناچ رہی تھی۔ چاروں طرف کھڑے میرے گھر والے اور محلے بھر کی عورتیں مرد اکٹھے ہو کر اپنی تالی سے تال دے رہے تھے، ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے اور میرے لیے تو جیسے وقت کا چلتا ہوا چکر رک گیا تھا۔ آسمان سے امرت کی گنگا اتر رہی تھی اور دھرتی اس امرت کو گرہن کر کے سچے سکھ کا آنند لے رہی تھی۔ اس سرشاری میں میری آنکھیں مندی جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں اتنی تاب ہی نہیں تھی کہ میں اپنی لاڑی کے سورج کی طرح چمکتے چہرے کی طرف دیکھ سکوں۔

مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں نے دیکھا کہ لاڑی میری دادی کے لائے ہوئے لڈوؤں سے بھرے تھال کو اپنے جھولے میں ڈال رہی تھی۔ لڈو جھولے میں رکھ کر اس نے تھال میں رکھے چاندی کے دس سکے بھی اٹھائے اور انھیں بھی اپنے جھولے کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

گوگلیانی میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ اب لاڑی کے لیے وہاں سب کے موجود ہونے کے باوجود اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر کوئی تھا تو صرف میں، جس کی طرف دیکھ کر وہ بار بار مسکرا رہی تھی۔

اس نے ذرا سا دم لے لیا تو وہ خود ہی بولی:

"اب تک تو میں بڑے بیٹے کی کڑمائی کی بدھائی دینے کے لیے گا رہی تھی۔ اب میں صرف اپنے لاڑے کے لیے گاؤں گی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ادا سے شرارت بھری نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں تو پہلے ہی اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو ناچتے ناچتے سرخ انار ہو رہا تھا۔ میرے اندر کا جوان مرد یہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کسی طرح بھی چونتیس پینتیس کی نہیں لگتی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے وقت اس کے لیے ٹھہر گیا ہو۔ گزرتے ہوئے وقت کا اس پر کچھ بھی اثر نہ پڑ رہا ہو اور جیسے وہ میری ہم عمر ہی ہو۔

اتنے میں اپنے جھولے کو سمیٹتی ہوئی وہ اٹھی اور پھر کھڑے ہو کر بازو لہرا کر اس نے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے اپنی طرف کھینچ کر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا، میرے ماتھے اور گال چوم کر گیت کی تان اٹھائی:

مجھ کو مل گیا میرا لاڑا

جیون بھر کا ساتھ ہمارا

ہم نے چن لی اپنی راہ

ٹنڈے لاٹ کی نہیں پرواہ

منڈیا میں مچھلی تو جال

دادی لا مصری کا تھال

گوگلیانی مجھے اپنے ساتھ لے کر گا رہی تھی، ناچ رہی تھی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے اپنے حسن کے جادو سے مسحور کر رہی تھی۔ سب ہنس رہے تھے، خوش ہو رہے تھے۔ لیکن میری خوشی کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔

لیکن وہ کہتے ہیں کہ جس مقام پر خوشی کی انتہا ہوتی ہے وہ مقام سوئی کی نوک کے ہزارویں حصے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ انسان کا وجود تو دور رہا۔ وہ اپنے تصور میں بھی اس مقام پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اس اونچائی سے اس کے قدم جب پھسلتے ہیں تو وہ رنج کی گہری کھائی میں جا گرتا ہے اور وہ خوشی جسے پانے کے لیے اس کا من مچلتا رہتا ہے، وہی سوئی کی نوک کی طرح اس کے وجود کے روئیں روئیں میں چبھ کر اسے چھلنی کرتی رہتی ہے، لہولہان کرتی رہتی ہے۔

یہی میرے ساتھ ہوا۔ زندگی کے اس موڑ پر جہاں گوگلیانی نے میرے گھر والوں کے سامنے مجھے اپنا لاڑا مان کر زندگی بھر ساتھ رہنے کا گیت گاتے ہوئے کہا تھا کہ اے لڑکے میں وہ مچھلی ہوں جو تمہارے جال میں پھنس چکی ہے۔

ہاں زندگی کے اسی موڑ پر میرا دل غم سے روشناس ہوا۔

ہوا یہ کہ میری لاڑی نے جب سے میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر یہ گیت گایا تھا کہ:

مجھ کو مل گیا میرا لاڑا
جیون بھر کا ساتھ ہمارا
ہم نے چن لی اپنی راہ
ٹنڈے لاٹ کی نہیں پرواہ
منڈیا میں مچھلی توں جال
دادی لا مصری کا تھال

بس اسی وقت سے مجھ پر نشہ طاری تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن جب لاڑی اپنا سوئیوں کندھوئیوں والا تھیلا کندھے سے لٹکائے ہمارے گھر سے اپنے ڈیرے کی طرف گئی تو میں ہانپتا ہانپتا گھر کی چھت پر چڑھ کر کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں اٹھلا اٹھلا کر چلتی اپنی لاڑی کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ مجھے دکھائی دیتی رہی تھی۔ اور جب وہ آموں کے جھنڈ کے پاس جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی، تب بھی میرے تصور نے اسے اس پگڈنڈی کے ہر موڑ پر کھڑا کر کے دیکھا کہ وہ وہاں کتنی خوب صورت لگتی ہے۔ میرے ہونٹ انہی بولوں کو گنگناتے رہے:

منڈیا میں مچھلی تو جال
منڈیا میں مچھلی تو جال

لیکن میرا یہ سپنا جاگتے میں دیکھا ہوا سپنا تھا۔

اس مقام پر جب میرے دل کو کسی طرح قرار نہیں آیا تو میں نے ماں سے سفید شلوار مانگی۔ اپنے بڑے بھائی کی شہر سے دھل کر آئی ہوئی استری کی ہوئی قمیص پہنی۔ سر پر کلف لگی پگڑی باندھی اور اس طرح اپنی طرف سے پورا چھیلا بن کر میں گوگلیانی کے ڈیرے کی طرف چل دیا۔ شام کے وقت وہاں اچھا خاصا جمگھٹ لگتا تھا۔

گوگلیانیوں کے مردوں کی بھٹیاں جن میں دن کے وقت وہ کسانوں کے لیے درانتیاں و کھرپیاں بنایا کرتے تھے، شام کے وقت وہ الاؤ میں تبدیل ہو جاتیں، ان میں ایک طرف گوگلیانیاں کھانا بناتیں اور دوسری طرف مرد آگ سینکتے رہتے، گودھول کے وقت جب کسان اور چرواہے لوٹتے تو ان کے جلتے ہوئے الاؤ کے گرد کبھی کبھی گانے بجانے کے پروگرام بھی ہو جاتے۔ اس دن شام کے دھندلکے میں میں وہاں پہنچا تو ویسا ہی جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ سب لوگ ارد گرد کھڑے تھے اور میری لاڑی بیچ میدان میں بوڑھے نمبردار کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ناچ رہی تھی گا رہی تھی:

آیا سیالکوٹ کا لاڑا
یہ تو من کا میت ہمارا
میں نے ایسی جوت جلائی
اس کی لوٹ جوانی آئی
اس کومل گئے بیتے سال
بوڑھے لا مصری کا تھال

لاڑی بے سدھ ہو کر گا رہی تھی۔ وہی شمع کی طرح دہکتا چہرہ، وہی ناگن سی لہراتی اس کی چوٹی اور۔۔۔۔
میرے دل پر چوٹ لگی۔ یہ تو میری لاڑی ہے صرف میری اور یہ کسی دوسرے کے ساتھ ناچ رہی ہے۔
زخمی سانپ کی طرح پھنکارے مارتا میں الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا تو لاڑی نے آدھے راستے میں ہی مجھے آ دبوچا:
"تم لوٹ آئے ناراض ہو کر۔۔۔ارے پگلے یہ تو ہماری روزی روٹی ہے۔ نمبردار کے ساتھ تو میں ڈھونگ کر رہی تھی۔"
لیکن میرا غصہ کافور نہیں ہوا۔ میں آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹ آیا۔

اس رات میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اگلے دن بھی نہیں۔ سارا دن اپنے گھر کی پچھلی اندھیری کوٹھری میں رضائی میں دبکا پڑا رہا۔ وہ رات وہ دن میرے لیے زندگی کی سب سے اندھیری رات تھی جس میں میرے تن بدن پر کانٹے چبھتے رہے۔ روح لہولہان ہوتی رہی۔ اگلے دن گوگلیانی آئی تو اسے دادی سے پتہ چلا کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ جب اس کے آواز دینے پر بھی میں باہر نہیں آیا تو وہ خود ہی اندر آ گئی۔ آتے ہی میرے ساتھ رضائی میں لیٹ گئی۔ مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اپنے دوپٹے سے میرے آنسو پونچھے، میرے ماتھے اور گالوں کو چوما۔

اتنے میں اس کے اشارے پر دادی میرے لیے چاولوں کی تھالی بھر کے لے آئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک لقمہ کر کے مجھے چاول کھلائے۔ آخری لقمے پر بولی:

"لے یہ بھی کھا لے، اتنے پیار سے تو میں نے اپنے خصم کو بھی کھانا نہیں کھلایا ہو گا۔" پھر وہ پاس کھڑی دادی سے بولی:

"سردارنی! تمہارا یہ پوتا بھی اب جوان ہو گیا ہے۔ اس کے لیے بھی بڑھیا سی لاڑی ڈھونڈ تو پھر میں اس کے بیاہ کی گھوڑی گانے آؤں گی۔"

"تو کیا دے گا رے، سیالکوٹ کے لاڑے، مجھے اپنی گھوڑی گانے کا۔" اس نے بڑے پیار سے ٹھوڑی سے میرا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تما کرے جیسی سندر چاند سی بہو"۔ میں نے کہا۔

"یہ بات ہوئی نا کچھ"۔

"لیکن... وہ میری لاڑی کی بہو ہو گی، نمبردار کی لاڑی کی نہیں۔" میں نے شرارت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کی ہنسی کے ساتھ ہی اس اندھیری کوٹھری کا کونہ کونہ میری لاڑی کے حسن کی چمک سے جگمگا اٹھا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ماں کی ممتا چھلک رہی تھی اور محبوبہ کا پیار بھی۔

تبسم فاطمہ

جرم

چھت ٹپک رہی ہے۔

چھت سے ٹپکتی پانی کی بوندیں ایسے گرتی ہیں کہ دیپا اندر ہی اندر ایک پل کو سب کچھ بھول کر عجیب سی لذت میں ڈوب جاتی ہے۔ عجیب سی درد بھری لذت۔ جسے مباشرت کے وقت چت لیٹی عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔

کبھی اس موسم میں وہ کتنی رومانٹک ہو جاتی تھی۔ کل جب وہ عورت نہیں تھی۔ آج کی طرح، عورت، جانگھوں میں بسنے والی عورت۔ منیش بھی اکثر مذاق کے موڈ میں ہوتا ہے تو کہتا ہے: "عورت جانگھوں میں ہی تو بستی ہے"۔

عورت! اسے خود سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔ ایسا کیوں ہے؟ عورت ہر معاملے میں زندگی کے ہر موڑ پر، تقدیس کی گرد جھاڑتے ہی چت کیوں ہو جاتی ہے۔ ایک دم سے چت اور ہاری ہوئی۔ مرد ہی جیتتا ہے۔ عورت چاہے کتنی بڑی کیوں نہ ہو جائے۔ اندرا گاندھی، مارگریٹ تھیچر سے لے کر...... عورت کی عظمت کہاں سو جاتی ہے اور صرف وہی جانگھوں والی عورت۔

پانی کی بوندوں میں ٹپ سے منیش کا چہرہ ابھرتا ہے، جو اکثر منیش سکسینہ بن کر صرف ایک مرد بن کر اسے ٹوکتا ہے۔ تم پھیل رہی ہو۔ تم سوٹ مت پہنا کرو۔ تمہارا جسم کافی پھیل گیا ہے۔ کولہے، سینہ، پشت کا حصہ، تم بہت بھدی ہوتی جا رہی ہو دیپا!

کچن کے پاس ذرا ہٹ کر جو بیسن ہے، وہاں اس نے بڑا سا آئینہ لگا رکھا ہے، اپنے سراپا کو روزانہ دیکھنے کے لیے۔ بدن کی ان برائیوں کو جاننے کے لیے جسے شادی کے صرف چند سالوں بعد منیش کی آنکھوں میں بارہا محسوس کیا ہے دیپا نے۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں پر چڑھے ہوئے گوشت کو بار بار چھو کر دیکھتی ہے۔ وہ فربہ ہونے لگی ہے اور منیش لمحہ لمحہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

ہوا کرے! شٹ...... بڑے بڑے فلسفوں کے درمیان اصلی چہرے کو پہچاننے میں برسوں پہلے دھوکا ہوا ہے اسے۔

چھت ٹپک رہی ہے۔ رات آہستہ آہستہ گھرتی جا رہی ہے۔ ایلیشا ایک بار چیخ کر روئی ہے۔ دیپا جب تک اس کے پاس دوڑ کر پہنچتی، کروٹ بدل کر وہ پھر گہری نیند میں سو گئی ہے۔ ایک ٹک وہ ایلیشا کو دیکھتی ہے۔ یہاں اس جسم سے پورے نو ماہ گوشت پوست کے اس ٹکڑے کو سلائی کی طرح کھول کر باہر نکالا ہے اس نے۔ اسی بدن سے جس کے نشان پر انگلیاں پھیرتا ہوا منیش ٹھہر جاتا ہے۔ پوچھتا ہے:

"تمہارے پیٹ پر یہ لمبے لمبے نشان کیسے آ گئے؟ کیا سبھی کو ہو جاتے ہیں؟ کسی ڈاکٹر سے کنسلٹ کیوں نہیں کرتیں؟ یہاں اتنا گوشت کیسے آ گیا؟"

نشان، گوشت، چربی، اسے لگتا ہے جسم کی ڈکشنری کے بس یہی لفظ رہ گئے ہیں جسے اپنی Intellectual آنکھوں سے پڑھتا ہے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے۔ اسے کریدتا رہتا ہے، چھیلتا رہتا ہے:

"دیپا! تم یہاں... یہاں اور یہاں سے بدصورت ہو رہی ہو۔ تمہارا پیٹ کافی نکل گیا ہے۔ چہرے پر جھائیاں پڑ رہی ہیں" اور کبھی کبھی مذاق میں کہتا ہے:

"دیپا تم عورت لگنے لگی ہو۔ اماں جیسی عورت"

بارش لگاتار ہو رہی ہے۔ جب سے بارش شروع ہوئی ہے ایک عجیب سا سناٹا باہر اور اس کے اندر اتر گیا ہے۔ اس کے ایک دم اندر اندر۔ اس نے دیوار گھڑی کی طرف دیکھا، گیارہ بج گئے ہیں۔ ایک ہمدرد، تشویش میں ڈوبی عورت چپکے سے اس میں سما جاتی ہے۔ منیش اتنی دیر کہاں رہ گیا؟ آج ضرورت سے زیادہ دیر ہو گئی۔ باہر کسی کام میں پھنس گیا ہو گا۔ آخر کو پریس رپورٹر ہے نا! جرنلسٹ، خود کو Intellectual سمجھنے والا۔

بارش کی ہلکی ہلکی پھوہار اور چھت سے ٹپکتی پانی کی بوندوں میں کچھ گزری بسری یادیں بھی گھل مل گئی تھیں۔

منیش سے اس کی لو میرج ہوئی تھی۔ تب ان دونوں کی شادی کو لے کر گھر میں کافی ہنگامہ ہوا تھا۔ کتنا طوفان مچا تھا۔ کمزور سا منیش، بزدل سا، گھر والوں کے سامنے بالکل سہما سہما اور اس کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی تھی دیپا۔ گھر، زمانہ، حالات۔

"اپنے فیصلے پر کمزوری اور بزدلی کی خاک مت ڈالو۔ فیصلہ کرو فوراً......" پھر پورے تیور اور اعتماد کے ساتھ وہ منیش پر کسی حکمراں کی طرح چھا گئی تھی۔

"لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں۔ تھوڑی سی پامسٹری مجھے بھی آتی ہے"۔ غلطی تمہاری نہیں منیش! تمہارا نام "م" سے شروع ہوتا ہے۔ سنگھ راشی! اس راشی کے لوگ، جن کی اگر بچپن سے ٹھیک پرورش نہ کی گئی تو وہ یا تو بہت بزدل بن جاتے ہیں یا پھر بہت خود سر۔ اور پھر تمہارا انگوٹھا بھی جھکا ہوا ہے۔ ول- پاور کی کمی ہے تمہارے یہاں! تم خود فیصلہ کر ہی نہیں سکتے۔ چلو یہ فیصلہ اب مجھے ہی کرنا ہو گا''۔

منیش نے ہار مان لی تھی۔ ایک کمزور ہنسی کے ساتھ اس نے دیپا کا ہاتھ تھام لیا تھا:

"ہاں! مجھ میں فیصلے کی بڑی کمی ہے دیپا"۔ وہ روہانسا ہو کر بولا تھا۔

"اعتماد کی رسی میرے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے پھسل رہی ہے۔ پلیز دیپا!" وہ اور قریب آ گئی۔

منیش کی آواز کسی گہرے کنویں سے آ رہی تھی:

دیپا! عورت کی ایک الگ سی تصویر ہے میرے اندر۔ ایک دم سیتا، مریم۔ ساوتری کی داستانوں جیسی نہیں، ان سے مختلف۔ شانہ بشانہ میرے ساتھ چلتی ہوئی، آج بھی اس دور میں بھی لڑکیوں کو مظلوم اور مرد کی جابر سلطنت کا ادنیٰ کھلونا کیوں تصور کیا جاتا ہے دیپا!؟ بتا سکتی ہو؟ ہم دونوں مرد عورت کی عام پریبھاشا بدل دیں گے دیپا! ہمیشہ دوست رہیں گے جیسے دوست رہتے ہیں"۔ وہ بولتا رہا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھرتی رہی۔ تصور میں ست رنگے

سپنوں کو بنتی رہی۔

یہ سپنا اتنی جلدی کیسے ٹوٹ گیا تھا؟ مسز منیش سکسینہ بن کر دلی کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں شامل ہوتے ہی یہ دوستی کیسے ٹوٹ گئی تھی۔

دوست؟ ہنسی آتی ہے۔ دوستی تین سالوں تک نبھی۔ ہاں "نبھی" ہی کہا جا سکتا ہے۔ دھیرے دھیرے فلسفوں کے کانٹے دار جنگل میں وہ کالے گھنے بادلوں کو دیکھتی رہی۔ خواب اتنے بدصورت کیوں ہوتے ہیں؟ اور فلسفے زندگی کی حقیقت کیوں نہیں بنتے؟ ذرا دور تک، ایک دم پانی کے بلبلوں کی طرح پھوٹ جاتے ہیں۔ پھوٹتے ہی سامنے والا ننگا کیوں ہو جاتا ہے۔

وہ منیش میں اب "بھوت" دیکھتی تھی۔ تنہائی میں جبلت والا ایک درندہ اس میں سما جاتا ہے۔ Sadist کہیں کا۔ وہ اسے توڑتا تھا۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں چھلچھلا آنے تک اس کے پورے وجود میں دیر تک گھناؤنی نفرت پیوست کر دیتا تھا۔

وہ محبوبہ اور دوست سے جانگھوں والی عورت بن جاتی تو جیسے خود پر شرم آتی۔ یہ مرد ہی کیوں جیتتے ہیں اور عورت چت کیوں ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ ہارنے والی۔ مہینہ دو مہینے اور سال گزرتے ہی وہ منیش میں اپنے آپ سے اوبے ہوئے دوست کو محسوس کرنے لگی تھی۔ جیسے اس کے لیے جو جذبہ یا احساس تھا اس کے اندر وہ بس سوتا جا رہا ہے۔ جو احساس تھا وہ اسے نہیں اس کے جسم کو لے کر تھا۔ ایک سدابہار غنچے کی طرح چٹکنے والے جسم کو لے کر۔ جیسے ایک جابر بادشاہ کی نظریں بدلنے لگی تھیں۔ وہ بدل سا گیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ پپٹ بنتا جا رہا تھا۔ نہیں پپٹ نہیں۔ کمپیوٹر یا مشین جو بھی کہیے! بس ایک میکانکی عمل رہ گیا تھا ان دونوں کے درمیان۔ باسی مکالمے، "کیسی ہو؟، کوئی خط آیا ہے، کوئی آیا تھا آج، ایلیشا سو گئی؟" نپے تلے جملے اور تھکان، اسے دیکھتے ہوئے بھی اس کے اندر کوئی مسکراہٹ نہیں جنم لیتی تھی۔ کوئی پیار، کوئی امنگ، کوئی اضطراب، کوئی ہلچل نہیں جاگتی تھی۔ بس ایک میکانکی عمل۔

رات ہوتے ہی، اندھیرا پھیلتے ہی، اس کے ہاتھ دیپا کے بدن پر۔ طوائف کے کوٹھے پر آئے عام گاہک کی طرح مچل اٹھے۔ اسے لگتا کہ انجانے میں کوئی اور اس کے مقابل سو گیا ہے۔ اسے نفرت ہوتی۔ اسے لگتا یہ منیش نہیں ہے کوئی اور ہے جو اسے اس عمل سے دیپا کو عورت ہونے کی رسوائی اور طعنوں سے لہولہان کر رہا ہے۔ لگاتار لہولہان کیے جا رہا ہے اور اس نے محسوس کیا۔

رات کے اندھیرے میں اسے محسوس کرتے ہیں۔ منیش اندھیرا کیوں کر دیتا ہے؟ اس کے بدن پر مچلتے ہوئے اس کے ہاتھ اسے بیگانے کیوں لگتے ہیں؟ اس کی آنکھیں رم جھم بارش کے وقت بند کیوں ہو جاتی ہیں؟

نہیں! تب وہ نہیں ہوتی ہے۔ اس وقت دیپا نہیں ہوتی ہے۔ کوئی اور ہوتا ہے منیش کے سامنے۔ کوئی اور جو کم از کم دیپا نہیں ہے۔ منیش کی بیوی نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہوتی ہے۔ کوئی بھی۔ فلم ایکٹریس۔ منیش کے دفتر میں کام کرنے والی کوئی لڑکی۔ میگزین اور رسائل میں چھپنے والی کوئی ماڈل یا بس اسٹاپ پر کھڑی کوئی لڑکی۔ کوئی بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ نہیں ہوتی۔ دیپا نہیں ہوتی۔

اسے لگتا ہے وہ ہانپنے لگی ہے۔ پہاڑ پر چڑھنے والے آدمی کی طرح۔ وہ ایسا کیوں محسوس کرتی ہے؟ منیش بدل رہا ہے۔ بدلا کرے! لیکن جب وہ اس کے ساتھ، اس کے ساتھ رہتا ہے تو منیش کو اس میں دیپا کو ہی محسوس کرنا

ہو گا۔ ہاں دیپا کو یعنی مجھے۔ مجھے ہی محسوس کرنا ہو گا۔

کبھی کبھی وہ صدمے سے یا غصے سے زوروں سے چیخ پڑتی:

"نہیں منیش میں یوں نہیں لیٹ سکتی"۔

اس کے ہاتھ سوئچ کی طرف بڑھ جاتے۔ لائٹ آن کرو منیش! مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ منیش نے لائٹ جلادی۔ چونک کر اسے دیکھا۔ نائٹی پھینک کر وہ غصے سے اس کے سامنے تن جاتی:

"یہ میں ہوں۔ میں ہوں منیش! دیپا، میں۔۔۔"

"ہاں تم ہی ہو۔ میں نے کب کہا کہ۔۔۔"

"ہاں تم نے نہیں کہا۔ لیکن میں جانتی ہوں۔ میرے لیٹتے ہی میں مر جاتی ہوں۔ مجھ میں کوئی اور آ جاتا ہے۔ یہ سچ ہے منیش! کوئی اور، تم جسے بھوگتے ہو۔ جسے محسوس کرتے ہو۔ اور میرے وجود میں پگھلے شیشے کی طرح نفرت اتار دیتے ہو۔۔۔"

"کیوں پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو دیپا" منیش حیرانی سے دیکھتا ہے: "پتہ نہیں میری غیر موجودگی میں کیا کیا پڑھتی اور سوچتی رہتی ہو۔ صبح دفتر جانا ہے۔ خدمت کرو۔ اس وقت میں Relax ہونا چاہتا ہوں"۔

وہ چیخ پڑتی ہے:

"میں Relax ہونے کے لیے نہیں بنی ہوں منیش۔۔۔" وہ بستر سے ایسے ہی اٹھ جاتی ہے:

"مجھے دیکھو! مجھ میں بھی ایک آگ دہک رہی ہے۔ یہ میں ہوں۔ دیپا!"

ہسٹریائی کیفیت کے تحت وہ رونا شروع کر دیتی ہے۔ منیش دھیرے دھیرے اسے منانے کو آگے بڑھتا ہے تو وہ غصے میں ہاتھ جھٹک دیتی ہے:

"پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می! لیو می الان! پلیز سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو"۔

دیپا دیکھتی ہے کہ منیش کے چہرے پر الجھن کے آثار ہیں۔ شکار کے پاس آکر بھی نامراد لوٹ جانے والے شیر کی طرح۔ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا ہے اور وہ محسوس کر رہی ہے۔ پلنگ مسلسل چیخ رہا ہے۔ بج رہا ہے۔۔۔!

"شٹ! منیش ایسے کیوں ہو جاتا ہے۔ کیا سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

صبح جب اس کا غصہ کافور ہوتا تو وہ نہائی ہوئی صبح کی طرح خوشگوار بن کر ایک گرم میٹھے چائے کے کپ کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر جاتی ہے:

"منیش ڈیئر! پتہ نہیں رات بستر پر ایک خبطی عورت کہاں سے سما جاتی ہے مجھ میں۔ معاف کر دو نا!"

"کر دیا۔۔۔" منیش ہنستا ہے۔ جانتا ہوں۔ ابنورمل ہو تم۔ تھوڑا تھوڑا میں بھی ہوں۔ تبھی تو تمہارے ساتھ مزہ آتا ہے۔ دراصل تمہارے پانے کے سپنے میں بھی تھوڑی سی Abnormality شامل تھی۔

آفس جاتے جاتے وہ جیسے اس کی دکھتی رگ پر پھر ہاتھ رکھ دیتی ہے:

"سارے مرد اس طرح بیوی سے ناراض ہو کر رات میں چارپائیاں کیوں توڑنے لگتے ہو۔ کوئی تو ہوتا ہے نا۔ مانو مت مانو، ہوتا ہے نا!"

منیش پلٹتا ہے۔ اسے یاد ہے ایلیشا کی پیدائش کے دو ماہ بعد اس سوال کے جواب میں منیش نے کہا تھا:

"تم غلط جا رہی ہو ڈیپا! تمہاری سوچ غلط ہے۔ تم سب کچھ غلط Angle سے کیوں دیکھتی ہو۔ یعنی جو ہے وہ غلط ہے۔ تم میں ایک دوسری عورت اندھیرے میں ہم بستری کے وقت آسکتی ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے باسی اور بور ہو جائیں گے۔ بہت بور! تب اندر کے احساس کو جگانے کے لیے کسی چٹخارے کی ضرورت تو پڑے گی نا۔ ابھی نہیں! اور ایسا کیوں سوچتی ہو کہ اندھیرے میں ہی مرد کے ذہن میں کوئی تصور بن سکتا ہے، بتی جلنے پر نہیں۔ ذہن میں خاکے تو کبھی بھی بن سکتے ہیں۔ لیکن عورت اپنے مرد کو اس کا موقع ہی کیوں دیتی ہے۔۔۔"

اور اسے لگا تھا منیش اس کے عورت ہونے کے نام پر ایک گندی سی گالی دے کر چلا گیا ہو۔ "عورت اپنے مرد کو اس کا موقع ہی کیوں دیتی ہے؟ کیوں دیتی ہے؟" ہتھوڑے کی طرح یہ جملہ اس کے ذہن پر بجنے لگا تھا۔ عورت! کیونکہ وہ بھوگ بن جاتی ہے۔ مسلسل بھوگ کی چیز۔ وہ نو ماہ اپنے مرد کی جبلت کو اپنی کوکھ میں سنجوتی ہے اور بدن پر بھدے نشان ابھار لیتی ہے۔ عورت اگر بھدی ہوتی ہے تو اس میں کس کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کتنی صفائی سے مرد سارا الزام عورت پر ڈال دیتا ہے۔

اسے لگتا ہے وہ ٹوٹ رہی ہے۔ ایلیشا کے آنے کے بعد وہ لگاتار ٹوٹتی جا رہی ہے۔ اس کے برابر بستر پر اس کے ساتھ ایک چھپکلی چل رہی ہے۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی چھپکلی اچانک اس کے بدن پر پھیل جاتی ہے اور اس پر اس لمحے صرف جسم سچ ہو جاتا ہے۔ برسوں سے پوسا پالا پیار۔ ایک میٹھے تیکھے وقتی احساس کے لیے۔ اتنی دور تک ساتھ چلا یقین دھندلا کیوں ہو جاتا ہے۔ کیوں؟

ٹپ ٹپ بارش کے قطرے لگاتار گر رہے ہیں۔ اسے خود سے نفرت ہوئی۔ نہیں! وہ بہت بری بنتی جا رہی ہے۔ اس کے خیال، اس کے حواس، سب پر کوئی انقلابی حملہ ہوتا جا رہا ہے۔ حملہ! اور حملے کا پہلا وار منیش کی طرف سے کیا گیا ہے۔

یہ مرد باہر سے آتے ہی فلسفوں کی تان عورت کے بدن پر کیوں توڑتی ہے؟ وہ ایلیشا کو دھیرے دھیرے تھپک رہی ہے۔ سو جا بیٹا! سو جا!

نیچے منیش کی گاڑی رکنے کی آواز آتی ہے۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئی ہیں۔ نہیں! وہ فاتح بننا چاہتی ہے۔ کسی کمزور لمحے میں بھی فاتح! جیسے زندگی کے ہر موڑ پر وہ ہے۔ یہاں بھی وہ فتح جیسا احساس پیدا کرنا چاہتی ہے۔

منیش کے پیروں کی چاپ زینے تک آگئی ہے اور اسے محسوس ہو رہا ہے۔ وہ ڈھال بن گئی ہے اور منیش تلوار ہے۔ تلوار میں بجلی کی سی چمک ہے اور ڈھال میں زبردست قوتِ مدافعت۔ چمکتی ہوئی برہنہ تلوار لہراتی ہوئی ڈھال کو زیر کرنا چاہتی ہے مگر زناٹے دار ناچتی ہوئی ڈھال کے آگے تلوار کو سپر ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ ڈھال اچھل کر تلوار کی نوک پر گرتی ہے۔ اور ڈھال کی قوتِ تمازت سے تلوار پگھل پگھل کر قبول کر لیتی ہے۔

ڈور بیل لگاتار بج رہی ہے اور بالکنی پر بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے ہیں جا رہے ہیں۔

غزلیات

آزاد حسین آزاد

غزل

رنگ کے ماہر کا جادو کھیل میں ایسا چلا
پان کی بیگی چلی ، نَے حکم کا اِکا چلا

حسرتوں کی پوٹلی آئی نہ پچھلی سیٹ پر
ہم کھڑے دیکھا کیے اور یار کا تانگہ چلا

یہ سنہری جھیل جھولی میں نہیں یوں ہی گری
پاؤں کی سوجن بتا میں دشت میں کتنا چلا

جھاڑ مت بقراطیاں دل ، یہ دیارِ حسن ہے
پاگلا بس عشق کر ، مت عقل کا سکہ چلا

کچھ قریبی لوگ پچھلے موڑ پر ہی رہ گئے
سنگ چلنا تھا انھی کے ، اس لیے اُلٹا چلا

ہاتھ جوڑے ، پاؤں پکڑے ، منتیں صد بار کیں
اس نے مڑ کے بھی نہ دیکھا اس طرح سیدھا چلا

اعجاز رافع

غزل

ہر اک امید کا حاصل پتا ہے پہلے سے
پہاڑ کاٹنے جاتا نہیں میں تیشے سے

ستارے ٹوٹ کے گرتے ہیں میری آنکھوں میں
ہزاروں دوست کیے دفن میں نے چپکے سے

بھلی تو لگتی تھی خوش منظری تیقن کی
ہوا نکلنے لگی ہے اب اس غبارے سے

وہ کامیاب ہمیں دیکھنا تو چاہتا ہے
سفر کو نکلیں تو آواز دے گا پیچھے سے

پلے بڑھے ہیں بھلائی کے پرچموں تلے ہم
گزرتے رہتے ہیں لشکر ہمارے خطے سے

نشستِ دل پہ ابھی ہو تو لے وہ نیم دراز
لیا کریں گے ذرا کام وام صوفے سے

ہمارے ہجر میں ہوتی ہیں کس کی آنکھیں سفید
کسی کو فائدہ کیا ہو ہمارے کُرتے سے

نیلوفر افضل

غزل

سائے دو روحوں کو اِک صحن میں ٹہلاتے تھے
قولِ دل کہتے ہوئے ہونٹ بھنچے جاتے تھے

پھول ہی پھول تھے اطراف و جوانب میں مگر
خوں کی مہکار سے حیوان کھنچے آتے تھے

شام ڈھلتے ہی کسی دھیان کے سرکش جھونکے
آتے جاتے تھے ، دلِ شاخ کو سہلاتے تھے

ایک دھوپ ایسی کہ آئینے میں سنولاتی تھی
ایک روپ ایسا کہ زیور جسے دمکاتے تھے

اِک کنارا کہ بھنور تھا ، مرے ملاح کی خیر
چلنے والے جسے تلووں تلے دہراتے تھے

جھڑ گیا شاخِ لبِ دوست سے وہ زخم وہ پھول
جس کی تعظیم کو بوسوں کی پرند آتے تھے

کیا کہیں ہم کہ محبت کے ہُلارے کیا تھے
درد کے دور تھے اور دل کی طرف جاتے تھے

جواد شیخ

غزل

ایسا مت کہہ کہ یہاں تُو غلطی سے آیا
دل وہ حجرہ ہے جہاں دکھ بھی خوشی سے آیا

خامشی آئی دریدہ دہنی سے تیری
دیکھنا مجھ کو تری کم نظری سے آیا

فتح مندی کا جو اِک رنگ ہے اُس چہرے پر
سرخروئی سے نہیں ، دل شکنی سے آیا

ورنہ راہیں تو مری سمت کئی آتی تھیں
اُس کو عجلت تھی سو بے راہ روی سے آیا

نئے ملبوس میں وہ جچ تو رہا ہے لیکن
کوئی پوچھے کہ یہ کس آمدنی سے آیا

اِس کہانی میں ترا ذکر بھی آیا تو سہی
کیا ہوا جو مری کردار کشی سے آیا

....

آزماتا ہوں مگر اور کسی پر ، افسوس!
یہ ہنر جبکہ مجھے اور کسی سے آیا

اب کوئی روک رہا ہو تو میں رک جاتا ہوں
مجھ میں یہ وصف غریب الوطنی سے آیا

موت کا خوف بڑا خوف ہے لیکن جواد
جو مجھے اُس کی توجہ میں کمی سے آیا

شاہد ماکلی

غزل

دل دہکتی ہوئی نیلگوں آگ سے ، آنکھ بے رنگ پانی سے لبریز ہے
ایک پیکر میں دو مختلف استعاروں کی موجودگی حیرت انگیز ہے

اندرونے کی لہروں میں باہر کی لہریں جو مدغم ہوئی ہیں تو غم بہہ گیا
آبشاروں کو اتنی بلندی سے گرتے ہوئے دیکھنا ولولہ خیز ہے

اشک سے لگ گئی آگ قرطاس کو ، آہ نے میرا آئینہ پگھلا دیا
جتنا ممکن ہو اس سے حذر کیجیے ، میری آب و ہوا آتش آمیز ہے

اس کا جلوہ کشادہ فضاؤں میں پہلے دکھائی دیا ، پھر سنائی دیا
بجلیوں کے چمکنے کی رفتار ان کے کڑکنے کی رفتار سے تیز ہے

بند آنکھوں کئی دن سے فطرت کی آوازیں سننے سمجھنے پہ مامور ہوں
اِن دنوں مجھ کو کچھ دیکھنے اور کسی سے کوئی بات کرنے سے پرہیز ہے

بیکراں کائناتوں کے اندر کہیں ایک سیّارہ ہے ، جس پہ گھر ہے مرا
گھر میں کمرہ ہے، کمرے میں بکھری ہوئی کچھ کتابیں ہیں، کرسی ہے اور میز ہے

نظمیں

حسین عابد

جال

او سنہرے بالوں والی بیَری
میری میز پہ تیرے بدن کا بچھڑا ہوا اک حصہ
دیے کی مدھم لو میں دمک رہا ہے
میری اکیلی شام کو
ایک سنہرے بال نے باندھ لیا ہے

شیشے کی دیوار کے پار
روشنیوں کے جال
اندر کندن رنگ شراب کا
آدھا بھرا گلاس
ایک سنہری ناگن جیسا
کروٹ لیتا
پھن لہراتا بال!

تیری خوش خوش چال میں دیکھوں
گھر جانے کی جلدی
میرے بندھے ٹکے جذبوں کو
ڈر جانے کی جلدی
نظم مکمل کر لوں
بال تمہیں لوٹا دوں گا

مسعود قمر

سیڑھی پہ بنا گھر

بارش
آسمان سے زمین تک
اور
زمین سے آسمان تک جانے کی
ایک سیڑھی ہے
ہمارے کھیتوں میں
لگی سیڑھی کو
سانچوں میں ڈھالے گئے
وقت کی دیمک کھا گئی
ہم نے سال ہا
اپنی زمینوں پہ
کسی بھی بارش کے
بلبلے بنتے نہیں دیکھے
وہ ارش کہاں گی
جو کھیت میں کھڑی
ایک عورت پہ برستی
تو
کھیتوں میں قہقہوں کی
بوچھاڑ ہو جاتی
زمیں اور عورت سے

....

آتی خوشبو میں
فرق کرنا مشکل ہو جاتا
وہ عورت کہاں گی
جو بارش میں
زندگی کو نہلا دیتی تھی
میں نے فیصلہ کیا ہے
اب کے بارش میں
وہ عورت اور میں
بارشی سیڑھی کے
عین درمیانی زینے پہ
ایک گھر بنائیں گے
بارشی سیڑھی کے
عین درمیانی زینے کے اوپر سے
اور
بارشی سیڑھی کے
عین درمیانی زینے کے نیچے سے
خود کو الگ کر لیں گے

رضوان علی

امید کا مشکیزہ

آس، امید کا پانی بھر کے
اک مشکیزہ
روز سویرے
پیٹھ پہ لادے
میں باہر
آجاتا ہوں

ٹوٹے پھوٹے دل کے ٹکڑے
گارا کر کے
پھر سے ان کی شکل بنانے
جوڑ لگانے
آجاتا ہوں

درد مٹا کے دل بہلانے
آگ بجھا کے پھول کھلانے
دکھتے دل پر پھایا رکھنے
پھونک پھونک ٹھنڈک پہنچانے
آس دلا کر شوق جگانے
نیند بُلا کر خواب دکھانے
آجاتا ہوں

....

اوک میں بھر کے آس کا پانی
مشکیزے سے پیتی ہیں
آزردہ، بے چین سی روحیں
تپتے دن سے شام ڈھلے تک
میرے ساتھ ہی رہتی ہیں
پیاس بجھاتی رہتی ہیں

تھکا ہوا ہر شام کو جب میں
گھر پر واپس آتا ہوں
مشکیزے کے خالی پن سے
خود خالی ہو جاتا ہوں

پھر جو سکھ سے رات گئے تک
سبز دنوں کی خواہش لا کر
آنکھ، صراحی، بادل، بارش
ایک بنا کر
مشکیزے کو بھرتا ہوں
روز سویرے
پیٹھ پہ لادے
پھر باہر
آ جاتا ہوں

علی زیرک

پُرکھوں کی مٹی کا نوحہ

جہاں اک نقرئی آواز کی قاشوں سے کبڑے دن لپٹتے تھے
تنک راتوں میں ٹھنڈے دودھیا شیشوں پہ کچی دھار گرتی تھی
وہاں اب راکھ اڑتی ہے
گریزاں نیند کے پہلو سے میٹھی لوریوں کا بور جھڑتا تھا
تو ہم چرخے کی گھوں گھوں سے، مشفق ہاتھ کی تھپکی سے
اک مانوس تارے پر اترتے تھے
"سمہ سٹہ" کی بھاری ریل کی سیٹی
بڑے پتھر، نکیلی کاسنی "گیٹی"
گھنے چھتنار، کڑوی جھاڑیاں، خرگوشوں کی چڑپڑ
بڑے شیطان کے قصے
ملائی اور بالائی کے تفرق سے وراجے
خدا کے کل جہانوں میں
تمنا کا ہرا خطہ
مرے پُرکھوں کی قبروں کا سفیدی سے لپا لٹھا
جہاں اب راکھ اڑتی ہے

عدنان محسن

لمحے کی تصویر

دھند میں لپٹی رات کے تن پر چھالے جیسا چاند
ٹیرس کے گملوں میں ٹھٹھرے سردرُتوں کے پھول
آنکھوں میں ٹھہرے پانی پر تیرتی نیند کی لاش
گھر کے سناٹے کو توڑتا رات کا قصہ گو
سینے کے بائیں کونے میں بیٹھا مدھم درد
آگ پکڑتے تمباکو کی دھیمی دھیمی لے
کمرے کی خاموش فضا میں مست دھویں کا رقص
کچھ قدموں کی دوری سے تکتی بے بس دیوار
ٹھنڈے فرش پہ پھن پھیلائے بیٹھا وقت کا سانپ
میز پہ اوندھے منہ لیٹی اک لمحے کی تصویر
آئینے پر نئی نویلی ویرانی کا عکس
کھونٹی پر لٹکے کپڑوں میں اک کالا مفلر
مفلر میں لپٹی پچھلے جاڑے کی بوجھل شام
کہرے کی خوشبو جیسی لڑکی کے کچھ پیغام
ڈائری کے صفحوں میں سلگتا "یاد کا آتش دان"
سارے میں لفظوں کے صندل کی مانوس مہک
جسم کی حدت سے عاری اک برفیلا بستر
جھریوں کے اک جال سے لڑتے بے قیمت آنسو
گزرے وقت کی رنگینی کا سوگ مناتا میں
مستقبل کی آس کا مرہم زخم پہ رکھتی تُو

تراجم

مترجم: معافیہ مختار احمد

Poet: Robert Frost

Acquainted with the Night

رات سے شناسائی

میری ایک رات سے شناسائی ہوئی ہے
میں بارش میں باہر گیا اور بارش میں واپس آیا ہوں
میں شہر کی دور ترین روشنی سے بھی آگے گیا ہوں

میں نے شہر کی اداس ترین گلی کو دیکھا ہے
میں چوکیدار کے پاس سے گزرا ہوں جو اپنے گشت پر تھا
اور وضاحت نہ دینے کی خاطر آنکھیں نیچی کر لی ہیں

میں ساکت کھڑا ہو گیا اور قدموں کی چاپ روک لی
جب دور سے ایک دخل انداز پکار
کسی دوسری گلی کے گھروں سے آئی

لیکن مجھے واپس بلانے یا خدا حافظ کہنے کے لیے نہیں
اور مزید یہ کہ ماورائی بلندی پر اب بھی
آسمان کی روشنی بکھیرنے والی گھڑی نے

منادی کی ہے کہ یہ وقت نہ تو غلط ہے نہ صحیح
میری ایک رات سے شناسائی ہوئی ہے

مترجمہ: فاطمہ مہرو
Poet: Charles Bukowski

The Definition
تعریف

محبت روشنی ہے
دھند بھری رات سے گزرتی ہوئی

محبت شراب کی بوتل کا ڈھکن ہے
جس پر پیر دھر دیا گیا ہو، غسل خانے
کی سمت بڑھتے

محبت تمہارے دروازے کی گمشدہ چابی ہے
جب تم نے شراب پی رکھی ہو

محبت وہ ہے جو واقع ہو
دس سالوں کے عرصہ میں ایک بار

محبت کچل دی گئی بلی ہے

محبت دیرینہ اخبار فروش لڑکا ہے
نکڑ پر رہنے والا، جو

....

اب یہ کام چھوڑ چکا ہے

محبت وہ ہے جسے تم خیال کرتے ہو کہ دوسرے
شخص نے اسے تباہ کر دیا

محبت وہ ہے جو معدوم ہو گئی
جنگی جہازوں کے دَور کے ساتھ

محبت فون کی بجتی ہوئی گھنٹی ہے
وہی ایک آواز یا کوئی اور
آواز لیکن کبھی بھی کوئی
مَن چاہی آواز نہیں

محبت غداری ہے
محبت جلنا ہے
بے گھروں کا کسی گلی میں

محبت فولاد ہے

محبت کا کروچ ہے
محبت ڈاک کا ڈبہ ہے

محبت چھت پر ہونے والی بارش ہے
کسی پرانے ہوٹل کی
لاس اینجلس میں

....

محبت کفن میں لپٹا تمہارا باپ ہے
(جس نے تم سے نفرت کی)

محبت گھوڑا ہے ٹوٹی ہوئی ٹانگ سے
کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے
جب پنتالیس ہزار لوگ
دیکھ رہے ہوں

محبت وہ طریقہ ہے جیسے ہم اُبالیں
کسی جھینگا مچھلی کو

محبت وہ سب ہے جو ہم نے کہا
جو تھا ہی نہیں

محبت وہ جونک ہے جسے تم
تلاش نہیں کر سکتے

اور محبت ایک مچھر ہے

محبت دستی بموں سے لیس پچاس سپاہیوں کا دستہ ہے

محبت بستر سے منسلک بول و براز کا خالی برتن ہے

محبت سین کوئنٹین میں برپا ہونے والا ایک فساد ہے
محبت ایک پاگل خانہ ہے

....

محبت ایک گدھا ہے جو مکھیوں سے بھری
گلی میں کھڑا ہو

محبت شراب خانے میں رکھا خالی اسٹول ہے

محبت کوئی ہنڈ نبرگ کی فلم ہے
ہوا میں بل کھاتے ہوئے ٹکڑوں کی

ایک لمحہ جو ابھی تک چیختا ہے

محبت دوستوفسکی ہے
رولیٹ وہیل کھیلتے

محبت وہ ہے جو رینگتا ہے
زمیں کے ساتھ ساتھ

محبت تمہاری عورت کا رقص ہے
مجبوراً کسی اجنبی کا سہارا لے کر

محبت ایک بڑھیا ہے
روٹی کا ایک ٹکڑا
چُراتی ہوئی

اور محبت ایک لفظ ہے
بہت زیادہ استعمال کیا گیا
اور بہت ہی
جلدی

خطوط

مطلوب الرسول قمر

السلام علیکم!

موجودہ صدی میں تعلیمی اور ادبی حلقوں میں جو سب سے زیادہ تشویش کی لہر پائی جاتی ہے وہ کاغذ کے روٹھ جانے کے امکان کی ہے۔

میں جب بھی اس تشویش کے حوالے سے کوئی بات سنتا ہوں یا کوئی خبر پڑھتا ہوں تو میرا احساس مجھے شہرِ ماضی کی ان گلیوں میں لے جاتا ہے جہاں درختوں کی چھاؤں تلے ٹاٹ اور بوریاں بچھائے، کپڑے کے بستوں میں چند قاعدے نما کتابوں کے ساتھ لکڑی کی پھٹی، کانے کے قلم، پلاسٹک کی دوات اور گاچنی لیے بچے بیٹھے ہیں اور خوش خطی کے مقابلے جاری ہیں۔ چند سال بعد جب وہ بچے ذرا بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں پھٹی کی جگہ کاپی اور قلم کی جگہ بہادر کا ہولڈر آ جاتا ہے۔ جب مزید بڑے ہوتے ہیں تو ہولڈر کی جگہ فاؤنٹین پن لے لیتا ہے۔ قلم چاہے کانے کا ہو، ہولڈر ہو یا پھر فاؤنٹین پن، کاغذ کے بغیر بے کار ہے۔ جب میرا احساس مجھے ان گلیوں کی سیر کرواتا ہے تو میرے نتھنے اس خوشبو کے احساس ہی سے پھیلنے لگتے ہیں جو کاغذ سے اٹھتی ہے اور خاص طور پر روشنائی سے لکھے کاغذ سے۔ انہیں گلیوں میں سیر کرتے ہوئے میں اپنے والد مرحوم کے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں جو ایک بہترین خطاط تھے۔ ان کے قلم دان میں رکھے ہوئے ہر طرح کی لکھائی کے قلم اور روشنائی کی مہک کے ساتھ کاغذ کی کھڑک۔ وہاں سے چلتا چلتا میں اپنے کالج کے تعلیمی دور میں پہنچتا ہوں تو میگزین کے ایڈیٹر ہونے کے ناطے کبھی پریس اور کبھی خطاط کے پاس جانا اور اسی مہک سے یادوں کو مہکانا۔ یہ کاغذ بھی عجب چیز ہے کہ جس کے ساتھ انسان کا رشتہ اتنا قدیم ہے کہ شاید درست طرح سے معلوم بھی نہ ہو کہ الہامی کتب بھی اسی رشتے کی بات کرتی نظر آتی ہیں۔

اور اب، جب کہ یہ احساس دامن گیر ہے کہ یہ احساس شاید ہماری آنے والی نسلوں کو میسر نہ ہو تو دل گرفتہ ہو جاتا ہے۔

لیکن کیا کریں کہ ارتقا کا قانون نیچرل سلیکشن کا متقاضی ہے۔ لہذا انسانی جذبات و احساسات نے اپنے اظہار کے لیے جب ای پرنٹنگ کو چن ہی لیا تو ہمیں اسی کو قبول کرنا ہو گا اور عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اس تبدیلی سے فرار کی بجائے اس کو دل و جان سے قبول کیا جائے اور اس میں ترقی کے راستے کھولے جائیں۔

سخن دان اسی ارتقا کو قبول کرنے کا نام ہے۔

ابھی یہ اس میدان میں نو وارد تو ہے لیکن اس کی پختگی اس بات کی غماز ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ اپنا مقام ضرور حاصل کر لے گا۔

اس وقت میرے سامنے سخن دان کا جولائی 2021 کا شمارہ ہے۔ جو اپنے انتخاب کی داد وصول کر رہا ہے۔

کسی بھی جریدے کے مدیران کے لیے سب سے نازک مرحلہ انتخاب کا ہوا کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد ترتیب،

سخن دان ان دونوں حوالوں سے اپنے مدیران کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔

اس شمارے کے مشمولات پر اگر میں سو فیصد اپنی ذاتی رائے دوں تو اس میں موجود دونوں مقالہ نما مضامین کی طوالت بوجھل پن پیدا کر رہی ہے۔ کیونکہ فنی نوعیت کے مضامین ہمیشہ اپنے اندر یبوست لیے ہوتے ہیں لہذا ان کی طوالت بعض دفعہ گرانی کا سبب بنتی ہے اور پھر جب ایک ہی جیسے دو مضامین تو۔۔۔۔

اس کے بعد افسانوں کی باری آتی ہے تو تینوں افسانے اپنی تکنیک اور موضوع کے حوالے سے بہترین قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے اگر کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو بہت مشکل ہے لیکن اس کے باوجود "ادے اور کشمالہ" نہایت متاثر کن افسانہ ہے۔

انتخابِ غزلیات بھی قابلِ تحسین ہے۔ جدید لب ولہجہ کی غزلیات جریدے کے معیار میں اضافہ کر رہی ہیں۔

نظموں کی بات کی جائے تو "ہمارے عزائم" اور "lastdropofwine" بہت عمدہ ہیں۔ گو کہ دیگر نظمیں بھی کم نہیں لیکن ان دو کی اٹھان الگ سے ہے۔